ارمغان ایران و ھند

(فارسی کا شعری سفر)

مصنف

ڈاکٹر زیب حیدر

ریڈر شعبہ فارسی

ویمنس کالج۔ عثمانیہ یونیورسٹی

نام کتاب	ارمغان ایران و ہند
مصنف	ڈاکٹر زیب حیدر
	ریڈر شعبہ فارسی
	ویمنس کالج، جامعہ عثمانیہ
	گھر کا پتہ 5/134 -3- 22
	کوچہ داراب جنگ، یاقوت پورہ، حیدرآباد - ۲۳
	فون نمبر 4417313
تعداد کتاب	پانچ سو
سن اشاعت	۱۹۹۶ء
قیمت	۸۰ (اسی) روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ	سید علی نظامی، نئی سڑک، چنچل گوڑہ حیدرآباد
طباعت	ہندوستان آرٹ پرنٹرس، بالسٹی کھیت،
	نور خاں بازار، حیدرآباد

یہ کتاب کی اشاعت میں اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت شامل ہے

انتساب

میرے والد بزرگوار

نواب سید محمد حیدر خاں

کے نام

جو میرے پہلے استاد رہے ہیں جن سے میں نے الفبا سیکھا اور جنہوں۔
مجھ میں شعر و ادب کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

کوتاه سخن

زندگینامه نویسی و بیان حالات بزرگان فرهنگ و ادب در هر کشور و هر زبانی همواره از گذشته تا کنون وجود داشته و دارد بویژه در سرزمین های شرق و ریشه دار فرهنگی چون ایران و هند امروز زندگینامه نویسی یکی از انواع ادبی در شمار داستان نویسی، نمایشنامه نویسی، مقاله نگاری طنزنویسی بحساب می آید۔ حتی افرادی در جهان شهرتشان به نوشتن بیوگرافی و شرح احوال است و فور شخصیت های برجسته در زبان ادب و فارسی همواره از قدیمترین ایام سیره نگاران و تذکره نویسان را واداشته است که در طول حیات زبان فارسی دست به نوشتن کتاب های تحت عنوان تذکره، تاریخ شعراء و نویسندگان بزنند که لزوم تکرار مطالبی در باره تذکره نویسی را درین گفتار کوتاه نمی بینیم در سالهای اخیر که برخورد فرهنگ و ادب شرق و غرب پیش آمد و تاثیر و تاثر او فرهنگ به صور گوناگوں بروز کرده است۔ شیوه تذکره نویسی و سیره نگاری گذشته هم دوچار تغیر و دگر گونی شده است و معیار های نقد ادبی و هنری و انواع دیگر نقد را بخود گرفته و به ابعاد دیگر زندگی افراد هم در تهیه، زندگینامه توجه شده است۔ ازین رو زندگینامه نویسی امروزه به عنوان یک نوع ادبی پویا و دلچسپ در محافل ادبی و هنری مطرح است البته این منوط به رعایت اصول علمی و هنری و شناخت روحیه، خوانندگان و مهارت در پرداختن صاحب زندگینامه دارد ۔ به عبارت دیگر این امر بسیار کار دقیق و ظریف است و همگان را یارای نوشتن زندگینامه مطلوب و دلپسند همگان نیست۔

شاید بتوان گفت رائج ترین نوع زندگینامه، شرح احوال شاعران است زیراکه تذکره های بزرگ شعری در مقایسه، دیگر تذکره ها به اندازه ای است که، امروزه کتابهائی در تاریخ تذکره های فارسی وارد و برخی زبان های دیگر داریم درحالیکه "موضوعات دیگر کمتر به

وجود چنین کتاب های برمی خوریم۔

همانطور که شرایط زندگی و مسائل مردم در جنبه های گوناگون نسبت به گذشت بسیار تغیر کرده به دلیل عدم فرصت کافی در امور ادبی و هنری هم بیشتر تمایل افراد به آگاهی یافتن از زندگینامه، بزرگان و مشاهیر و انتخاب بهترین اشعار شاعران و آثار هنرمندان در رشته های دیگر است۔

ازین رواست که در عصر کنون ما به مجموعه آثاری برمی خوریم که حالات، آثار، سبک و نمونه اشعار تعدادی شاعر را در بردارد، اینگونه آثار اگر باروش علم و دقیق همراه بامعیار های هنری فراهم گردد خود می تواند خدمتی شاسته در ارتقای ادب باشد۔ بویژه اشخاصی که کارنامه حیات آنان میراث و سرمایه فرهنگی و ادبی کشورهای متمدن و دارای قدمت تاریخی چون ایران و هند باشد۔

کتابی که پیش رو دارید درواقع هدف گردآورنده آن چنین بوده است که بدان اشاره شد اما اینکه تاچه حد درین کار کامیاب شده قضاوت آن به عهده خوانندگان، وخیره و باانصاف است۔ سرکار خانم دکتر زیب حیدر این بار دست به کار تازه ای زده اند زیرا زمین های تحقیق ایشان بیشتر بررسی اسناد و تاریخ انشاء نویسی و تهیۂ مقالات تاریخی، مذهبی بوده و در این رشته ها کارهای خوبی چه در زمینه تالیف وچه ترجمه و تصحیح انجام داده اند که ذکر جزئیات آں دراین گفتار کوتاه امکان پذیر نیست۔

مولف محترم دراین کتاب زندگی و آثار و سبک و نمونه آثار تعدادی از شاعران نامور و سرشناس ایران و هند را که در عرصه زبان و ادب فارسی جایگاه ویژه ای دارند گردآورده و مجموعه ای به زبان اردو برای علاقه مندان فراهم، آورده اند امید است که این کوشش موجب شود تا

افراد بیشتری به ادب فارسی روی آورند و میراث هزار ساله ادب فارسی را پاس دارند۔۔امید است که خداوند متعال به ایشان توفیق عنایت فرماید تا در آینده شاهد آثار دیگر ایشان باشیم۔

ابو القاسم رادفر

عضو حیات علمی پژوهشگاه علوم انسانی

حیدر آباد۔ دوم نومبر ۱۹۹۶ء

استاد مهمان دانشگاه عثمانیه

بخش فارسی

تعارف

اوراق تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ فارسی زبان ہندوستان کی سرزمین پھنا ور پر تقریباً ہزار سال تک زبان رسمی کی حیثیت سے اپنا سکہ جمائے ہوئے رہی ۔ ادبیات فارسی کا دامن شعر و نثر، تاریخ و تصوف، فلسفہ و طب، ہئیت و نجوم کے گران بہا جواہر ریزوں سے اس قدر مملو ہے کہ اس کی ارزش و اہمیت کا انکار کسی صاحب نظر ناقد و محقق کے لئے ناممکن ہی نہیں دشوار بھی ہے ۔ جہاں اساتذہ سخن کے دواوین و نثری شہکار اس بات کے گواہ ہیں وہیں تواریخ عہد شاہان مغلیہ ہند و سلاطین دکن اپنے بے بہا خزاین سے اس زبان کی عظمت کا اعتراف کر رہے ہیں اور ان ادوار کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی کارناموں کے امین بھی ہیں ۔

زیر نظر مجموعہ مقالہ جات " ارمغان ایران و ہند " فاضل مقالہ نگار کی اس مساعی کا عصارہ ہے جس کے ذریعہ موصوفہ نے بھرپور کوشش کی ہے کہ متقدمین سے معاصرین تک جتنے مشاہیر شعراء ان کی جلب توجہ کا باعث ہوئے ان فن پاروں کا اپنی مقدور بھر احاطہ کریں

ڈاکٹر زیب حیدر نے سب سے پہلے " شاہنامہ فردوسی " کو معرض بحث میں لایا ہے ۔ جس کے متعلق خود فردوسی طوسی نے اپنی عرق ریزی کا اس شعر میں اظہار کیا ہے

بسی رنج بردم بدین سال سی
عجم زندہ کردم بہ این پارسی

" شاہنامہ " ایران کا وہ قابل قدر انسائیکلوپیڈیا محسوب ہوتا ہے جو قبل اسلام سے لے کر عہد غزنوی تک کے سیاسی، تمدنی، اجتماعی و ادبی نشیب و فراز کا آئینہ دار ہے ۔ اور اس دور کا معتبر ماخذ بھی ۔ جسے ادبیات فارسی کے عناصر اربعہ کا ایک اہم ستون بھی شمار کیا جاتا ہے ۔

امام المتغزلین سعدی شیرازی کے منظوم و منثور تخلیقات کو مورد نظر قرار دیکر ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو موصوفہ کے صاحب نظر ہونے کی علامت ہے ۔ سعدی پر قلم تو

بہت سی ہستیوں نے اٹھایا ہے مگر یہ مضمون فاضل مقالہ نگار کی ارادت مندی کا مظہر ہے۔

مقالہ "حافظ و شعر حافظ" میں پہلے اس عہد کے معاشرے پر مرتب ہونے والے محاسن و معائب کو کلام حافظ پر اثر انداز ہونے کا ذکر ہے اور پھر ان تاثرات کو شعر حافظ میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حافظ کی جذبات نگاری بے ثباتی کائنات، اخلاقی اقدار، فلسفیانہ خیالات، دوستوں سے تلطف، دشمنوں سے مداوا، عشق و عرفان کی مستیوں سے سرشار اشعار کو لطیف انداز میں نذر قارئین کیا گیا ہے۔

عمر خیام نیشاپوری کی حیات و کلام پر بسوط مقالہ سپرد قلم ہے۔ خیام کی حیات سے متعلق تفصیلات متعدد تذکروں سے دستیاب ہوتے ہیں مگر کلام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا اہم مسئلہ ہوتا ہے اور یہ فرض مصنف نے بطرز احسن نبھانے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کے بین السطور خیام کی فکر کی روشنی میں تخلیق کائنات کے پوشیدہ رموز کی تلاش کے موضوع کا ذکر ہے۔ حق تو یہ ہے کہ فٹز جیرالڈ، محقق جرمنی نے خیام کے افکار کو رند مشربی پر محمول کیا ہے۔ صوفیاء اس کو عرفان کا جامہ پہناتے ہیں۔ فلسفی اس کے اشعار میں فلسفیانہ تخیل کو ضوفشاں پاتے ہیں بہرحال فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مولانا روم اپنی مثنوی کے سبب شہر آفاق ہیں۔ جس کو "ھست قرآن در زبان پھلوی" کہا جاتا ہے۔ مگر در حقیقت مولانا کا عشق ایک نادر شان تغزل کا حامل ہے "دیوان شمس تبریز" اس کا بین ثبوت ہے جو دراصل مولانا روم کا کلام ہے جو ان کے پیر و مرشد کے نام سے متعارف ہے۔ یہاں مولانا کی غزلیات کو موضوع بحث قرار دیا گیا ہے اور اس میں عشق کی سرگرمی، ہجر کا اضطراب جو کلام مولانا میں جاری و ساری ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان آنے والے بے شمار شعرا میں ایک نام عرفی شیرازی کا ہے جو عہد جہانگیری میں وارد ہندوستان ہوا یہ جوان سال شاعر جوانی ہی میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ اس کے سرمایہ سخن میں غزل کو نمایاں مقام حاصل تھا قصیدہ تو وہ کسب معاش کے لئے نظم کرتا تھا چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی
تو از قبیلہ عشقی وظیفہ ات غزل است

عرفی سبک ہندی کا نمایندہ شاعر رہا ہے لہذا مضمون آفرینی۔ معاملہ بندی محاسن شعری، ندرت خیال سے اس کا کلام مملو ہے اور اس امر کی شہادت اس مضمون میں پائی جاتی ہے۔

ایرانی شعراء کی صف آخر میں پروین اعتصامی کا تذکرہ شامل ہے جو عصر پہلوی کی ایک نامور خاتون شاعرہ تھی اور جو ادبیات معاصر میں مردوں کے شانہ بہ شانہ جہاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس نے معاشرہ کی کمزوریوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ کارگر اور مزدور کی طبقاتی کشمکش کو منظر عام پر لانے کی جسارت کی ہے۔ عورت کو اس کے مقدس و عظیم مرتبہ پر فائز کرنے کی کوشش کی۔ تصویر زن کو کائنات کے چوکھٹے میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ اور اس کو اس کے صحیح مقام پر فائز کرنے کا حق ادا کیا ہے۔

" ارمغان ایران و ہند " کا دوسرا پہلو ان اھل قلم شعرا پر مبنی ہے۔ جو ہندستان میں معرض وجود میں آئے۔ جن میں سرفہرست خسرو اور ان کے ہم عصر حسن سجزی ہیں۔ ہر دو شعراء کا عہد ایک تھا اور ممدوحین بھی ایک ہی۔ حسن سجزی کے کلام میں سوز و گداز، تاثر، جاذبیت بدرجہ اتم تھی مگر وہ خسرو کی طرح پر گو نہیں تھے۔ لہذا زبان زد خاص و عام نہ ہوسکے مگر عرفان و تصوف ان کے اشعار کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ خسرو تو ہندوستان کے ذوللسانین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور وہ معاملہ بندی کے موجد تھے ان کے اشعار ہر محفل سماع میں گائے جاتے ہیں اور عرفا و ارادت مندوں کے زخم ہجراں کا موثر مرہم ثابت ہوتے ہیں اس مضمون میں اس خصوصیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

مرزا بیدل، سبک ہندی کے سہل ممتنع اشعار کے سرتاج مانے جاتے ہیں اور ان کی پیروی کا غالب نے بیباکانہ اعتراف کیا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

بیدل کے کلام میں تمثیل، مبالغہ آرائی۔ محاسن صوری معنوی کا استعمال ہر قدم پر دکھائی دیتا ہے۔ان کے اشعار کے عمق میں غوطہ زنی کر کے درھای شہوار حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر زیب حیدر نے " غالب کے فکر وفن " پر اظہار تطر کر کے اپنی حس لطیف کا مظاہرہ کیا ہے۔غالب ہمیشہ اپنے فارسی کلام پر نازاں رہے اور اردو اشعار کو "مجموعہ بی رنگ" سے تعبیر کرتے رہے۔غالب نے عرفی، خاقانی و بیدل جیسے دقت پسند شعراء کی پیروی کی ہے۔ انہوں نے عام راہ سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی شاہراہ بنالی تھی اور اس پر پوری شان وعزم کے ساتھ گامزن رہے۔اور "سرخیل غزل گویان ہند کہلائے"

ڈاکٹر زیب حیدر فارسی ادب کے دامن وسیع میں اور مزید اضافہ کی خواہاں ہیں انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے قبل ازیں دو کتب (۱) ترجمہ تواریخ آصف جاہی (۲) تاریخ دکن کے چند گوشے۔زیور طبع سے آراستہ کر کے ھدیۂ قارئین کئے ہیں ان کی یہ مساعی قابل افتخار بھی ہے اور درخور اعتنا اضافہ بھی۔

ڈاکٹر شریف النساء انصاری
سابق پروفیسر و صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی

مقدمہ

ایران و ہند تعلقات بہت ہی قدیم اور مستحکم ہیں۔ فارسی زبان کا اثر ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر بہت پڑا۔ ہمارے معاشرے میں ایرانی تہذیب رچ بس گئی ہے۔ فارسی زبان ہمارے لئے کوئی غیر زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان کوئی آٹھ سو سال تک ہمارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے اور ہمارے ملک کی انتظامی زبان رہی ہے۔ ہمارے تمام اسناد جو مغلیہ، بہمنی، عادل شاہی، عماد شاہی، برید شاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی دور کے ہیں یہ سب فارسی زبان ہی میں ہیں۔ اور ہماری تہذیب پر ایران کے تمدن اور ثقافت کا گہرا اثر ہے ہمیں آج بھی فارسی زبان و ادب کے پڑھنے سے ایران کی تہذیب و تمدن اور وہاں کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی رہی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری اردو شاعری نے بڑی حد تک فارسی زبان کا اثر قبول کیا۔ خصوصاً غالب میر، سودا، ذوق، میر حسن، دیا شنکر نسیم، انیس، دبیر، تعشق وغیرہ کی غزلوں کی مثنویوں اور مرثیوں پر ہمیں فارسی زبان کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور ایرانی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اسی لئے ہمیں فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں پر میں نے چند فارسی شعراء کا کلام اور ان کے حالات پیش کئے ہیں اور فردوسی سے پروین اعتصامی تک فارسی کے شعری سفر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں انہیں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں خسرو و حسن جیسے شاعر ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ان کی شاعری یہیں پھلی پھولی۔ شروع میں ایرانی خسرو کو شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن اب انہوں نے خسرو کی شاعری کا اعتراف کر لیا ہے اور ایران میں خسرو دوست اہل قلم ان کے کلام پر تحقیق کر رہے ہیں اور خسرو پر ایران میں ایک عالمی کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی جس میں تمام دنیا سے دانشمند تشریف لائے تھے۔ جو خسرو شناسی کی دلیل ہے۔

خسرو کے ہمعصر ہی حسن ہیں جن کی شاعری پر بھی ایران کی تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں ہندوستانی عوامل بھی نظر آتے ہیں ۔ میں نے اس کتاب میں خسرو و حسن کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فردوسی کے شاہ نامہ کی تاریخی تہذیبی اور تمدنی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ہمیں خود اپنی شناخت میں مدد ملتی ہے ۔ فردوسی نے کہا ہے ۔

عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اور فردوسی کے بعد خیام و حافظ جیسے شعراء کے کلام سے روشناس کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ خیام کا کلام فارسی شاعری کی جان ہے اور خیام کی رباعیات ہی کی وجہ سے اس کا نام زندہ ہے اس کے کلام کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ خیام نے زندگی کے مختلف مسائل کو اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے وہ عیش امروز کو فکر فردا پر ترجیح دیتا ہے اور Epiqurin تھیوری Eat, drink be Merry کا معتقد ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہے وہ زندگی کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تمام مفکروں اور فلسفیوں کی طرح وہ بھی معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے ۔

حافظ کا کلام زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے ۔ غم محبوب کو وہ دل سے لگائے رہتا ہے لیکن وہ صرف حال ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور جو کچھ بھی حال میں میسر ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتا ہے ۔ "غم فردا" اور فکر "دی روز" کو فضول سمجھتا ہے ۔ شوپن ہاور نے کہا ہے ۔

"مختصر زندگی ، مختصر تر جوانی اور مختصر ترین خوشی کی وہ
گھڑیاں جو انسان کو خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہیں ۔"

اسی لئے حافظ کا خیال ہے جو بھی کرنا ہے وہ آج ہی کر ڈالنا چاہیے ۔ کل کس نے دیکھا ہے ۔ حافظ زندگی کے اس معمہ کا حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ملاوں کی پردہ دری کرتا ہے ۔ اخلاق کی تعلیم "با دوستان تلطف با دشمنان مدار" کہہ کر کرتا ہے اور کبھی قسمت پر قائل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ۔

کشتی نشستگانیم اے باد شرط برخیز

باشد کہ باز بینم آں یار آشنارا

حافظ کا کلام فارسی شاعری کو باقی رکھنے کے لئے کافی ہے جو کوئی اس کو پڑھتا ہے اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غالب و بیدل کے کلام پر بھی میں نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی یہ دونوں شاعر ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں ہیں لیکن ایران میں ان کی شناخت نہیں تھی ایرانی ان کو شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے لیکن آج کل غالب اور بیدل کی شاعری کی پہچان ایران میں ہو رہی ہے۔ بیدل کو ایک صوفی اور فلسفی شاعر سمجھ کر اس کے کلام کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔ اور اس کے کلام سے اور حالات زندگی سے متعلق محقق تحقیق کر رہے ہیں مقالہ لکھ رہے ہیں۔

عرفی کے کلام اور شخصیت کے چند پہلو یہاں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے عرفی ایک ایسا شاعر ہے جس کا خمیر تو ایرانی ہے لیکن بود و باش ہندوستان میں اختیار کر کے اس نے ہندوستانی لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اور یہیں دربار سے منسلک ہوا اور شاعری کو اپنا پیشہ قرار دیا یہ بہت ہی خود دار شاعر تھا جس کی جھلک اس کے کلام میں ملتی ہے۔ عرفی نے مغل بادشاہوں کے دربار میں داد تحسین حاصل کی اور اپنے حریفوں کی چشمک کا بھی شکار رہا جس کا ہر درباری شاعر کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں اس کی نشان دہی کی ہے۔

میں نے پروین اعتصامی کے حالات زندگی اور شاعری کا بھی یہاں جائزہ لیا ہے۔ پروین ایک دولت مند گھرانہ کی چشم و چراغ ہے۔ وہ اعتصام الدولہ کی نور چشم ہے بہت ہی ناز و نعم سے اس کی پرورش ہوئی۔ لیکن اس کے دل میں ملت کا درد موجود ہے اور وہ اپنی نظموں میں اپنے اس احساس کو پیش کرتی ہے۔ اس کی نظمیں "مرد و زن" اور اشک یتیم، اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ زمانہ ایران کے دورہ مشروطیت کا عوائلی زمانہ تھا جب کہ بہت سے اہل قلم سامراجی ظلم و استبداد کے خلاف مظلوم عوام کے درد کو اپنے کلام میں پیش کر رہے تھے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ پروین نے ان نظموں میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو عوام کے لئے اصلی

حالت میں پیش نہیں کیا ہے کیونکہ وہ ایک سامراجی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی نظموں کو پڑھنے سے قاری کا یہ تاثر رہتا ہے کہ پروین مظلوم عوام پر جو جبر و استبداد ہو رہا تھا اس سے متاثر تھی اور بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنی شاعری میں اس کی عکاسی کی ہے۔ اب میں کہاں تک ان مضامین کی تیاری میں کامیاب رہی ہوں اس کا تصفیہ تو محترم قارئین ہی کر سکیں گے۔

سب سے پہلے میں اپنے محترم اساتذہ ڈاکٹر رضیہ اکبر، پدما شری ڈاکٹر شریف النساء انصاری، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کی مشکور ہوں۔ جن کی رہنمائی اور نظر عنایت ہمیشہ شامل حال رہی۔ اس تحقیقی کام میں استاد محترم پدما شری امیر حسن عابدی صاحب کی شفقت و استاد محترم عبدالودود اظہر صاحب کی ہمت افزائی کا اثر ہے۔ اور جب تک کہ میں اپنے مہمان استاد ڈاکٹر ابو القاسم رادفر صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں میرا یہ خوشگوار فرض ادا نہیں ہو سکتا آپ نے بعض مضامین کی تیاری میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ اس کتاب کا پیش لفظ بھی لکھنے کی زحمت کی۔ میں اردو اکیڈیمی حیدرآباد آندھرا پردیش کے چیرمن سکریٹری کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت میں اکیڈیمی کی جانب سے جزوی اعانت کی گئی۔ آخر میں، میں جناب شاہنواز علی مرزا پروپرائٹر ہندوستان آرٹ پرنٹرس کی مشکور ہوں کہ آپ نے بہت ہی تندہی سے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کیا ورنہ میرے لئے یہ کام ناممکن ہوتا۔

ڈاکٹر زیب حیدر

شاہنامہ فردوسی کی تاریخ تمدنی

اور

ادبی اہمیت

شاہنامہ سرتاسر ایرانی تاریخ پر منحصر ہے اور یہ ایک طرح سے ایران کی تاریخی سند ہے سامانی دور کے ایران میں وطن دوستی اور قوم پرستی کے جو جذبات تازہ ہو رہے تھے۔ ان کا لازمی تقاضا تھا کہ اپنی پچھلی تاریخ کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا جائے۔ سامانی حکمرانوں نے اس طرف خاص توجہ کی اور دقیقی کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ وہ ایران باستان کی تاریخ نظم کرے لیکن وہ اس کام کو تکمیل نہ کر سکا۔ اس کی تکمیل فردوسی کے نصیب میں تھی۔ فردوسی صرف شاعر ہی نہیں تھا بلکہ سچا قوم پرست اور وطن دوست بھی تھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش کی فضاء اور تحریکوں سے گہرا تاثر قبول کیا اور اسی ضمن میں اسے ایران قدیم کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا جو موجودہ ایران دلوں میں نئی گرمی اور حرارت پیدا کر سکے۔ اس لگن، وشوق اور شدید وطن دوستی کے جذبہ نے اس سے شاہنامہ لکھوایا جو بلاشبہ ایران کی قدیم تاریخ کا ایک مکمل اور واحد ماخذ نہیں تو بہت بڑا ماخذ ضرور ہے اور اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے۔ ایران کی قومی داستانوں اور قدیم تاریخ کو زندہ کرنے اور فارسی زبان میں ایک نئی جان پھونکنے کے لئے ابو القاسم فردوسی کا کارنامہ بلاشبہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ایران کے بادشاہوں اور پہلوانوں کی داستان لکھنے کا طریقہ ایران میں قدیم زمانے سے چلا آتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ہخامنشیوں کے زمانے میں بادشاہوں کے حالات اور ان کے کارنامے لکھے جاتے تھے۔ اس طرح شاہناموں میں سے ایک شاہنامہ جو ہمارے زمانے تک پہنچا ہے۔ "خدائی نامک" یا "خدائی نامہ" پہلوی ہے۔ یہ شاہنامہ سامانیوں

کے دور حکومت میں لکھا گیا اور ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی زبان سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو آج ناپید ہے۔ ایسی پہلوی کتابیں جو شاہنامہ کا ماخذ ہیں اور ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک کارنامک اردشیر بابکان اور دوسری یادگار زایران ہے، جسے شاہنامہ گشتاسپ بھی کہتے ہیں شاہنامہ کے جملہ ماخذوں میں کتاب اوستا اور اس سے متعلق دوسری کتابیں جیسے بند ھیشین اور دینکرت وغیرہ شامل ہیں۔ یزدان اور اہرمن کا قصہ زرتشت سے متعلق روایتیں۔ آفرینیش کی داستان، کیومرث اور کیانی بادشاہوں کی حکایتیں،، ضحاک وفریدون کی کہانیاں، براہ راست اوستا سے لی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان داستانوں میں سے بعض وہ داستانیں ہیں جیسے ضحاک وکاوہ وغیرہ مشترک آریائی ہند ایرانی داستانوں میں شامل ہو گئی ہیں بلکہ ان کا رشتہ ہند ایرانی دور سے اور آگے بڑھ کر یوریشیائی ہو جاتا ہے۔ شاہنامہ میں رستم واسفندیار جیسے قصے بھی موجود ہیں۔ ہخامنشی دور کے بعد ایرانی ماخذوں کے سوا دوسرے ماخذ سے جیسے مشرقی ایران یعنی زابلستان وغیرہ سے لئے گئے ہیں۔ فردوسی سے پہلے آخری سامانی شاعر دقیقی طوسی تھا جس نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا، لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اسے پایہ تکمیل کو پہنچا نہ سکا۔ دقیقی صرف دس ہزار شعر جو ظہور زرتشت سے لیکر جنگ گشتاسپ اور ارجاسب سے متعلق ہیں لکھ سکا۔ فردوسی نے دقیقی کے ان اشعار کو اپنے شاہنامہ میں شامل کر لیا اس کا دعوی ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک ایرانی بسوط تاریخ موجود تھی۔ لیکن مرتب ومدون نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے۔ ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بوڑھے پراتم موبد جمع کئے اور ان پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کروائی۔ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ چونکہ ناتمام چھوڑ گیا تھا اس لئے خود فردوسی نے اس کی تکمیل کی۔ شاہنامہ کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اکثر نقادوں نے اس کی اس اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر براون اعتراف کرتے ہیں کہ شاہنامہ ساسانی دور اور ایران قدیم کی حقیقی تاریخ پر مبنی ہے۔ رضا زادہ شفق نے بھی اس امر کو ثابت کیا ہے کہ یہ دل بسنیہ اور یہ ارجمند دیوان ایرانیوں کی قومی تاریخ کی سند ہے۔

صاحب شعر العجم یوں رقم طراز ہیں ۔ " اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخ کے درجہ سے گرا دیا ہے تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی ۔ ہوشنگ مستوفی اپنی کتاب " شعرائے بزرگ " ایران میں یوں لکھتے ہیں ۔

" در آسمان شعر و ادب ما و از این ستارگان درخشاں بسیار وجود داشت کہ ما تا پایان جہاں ہم پر تو علم و ہنر آنہا محتاج خواہیم بود ولی یکی از آنہا کہ بواسطہ بستگی بزبان تاریخ ما خدمتی کہ بملیت ما کردہ است بیش از ہمہ نامش راشنیدہ ام و تمام فارسی زبانان احترام خاصی برایش خوانند و در میان عامہ مردم اشتہار کافی دارد حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی است کہ زندگی خود را وقف احیاء زبان پارسی و تاریخ پرافتخارش خود ما نمودہ است "

عطاالله روحی کرمانی اپنی کتاب زبدہ شاہنامہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

" در این دار و دگیر فردوسی برخواست و کاخ بلند پایہ ملت لابرآوج داشت دوران بزرگی و عظمت و خرمی و جلالت وآئین و رسوم پیشین را پدید و تمام بزرگان این و شاہنشاہان قہرمان این مرز و بوم را جاوید ساخت و زبان کثیر ایں پارسی را رونق افزاو و جلوہ اسی سزا بخشید

محمد علی فروغی اپنی کتاب " منتخب شاہنامہ " کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

" اما شاہنامہ فردوسی ہم از حیث کمیت و ہم از جہت کیفیت بزرگ ترین اثر ادبیات و نظم فارسی است بلکہ میتواں گفت یکی از شاہکارہای ادبی جہان است و ملل دیگر قدیم و جدید کہ دارای ادبیات معتبر میباشد فقط چہار منظوم دارد کہ میتواں باشاہنامہ مقابیہ کرد، شہکار فردوسی اگر برآں مقام برتری داشتہ باشد پست تر سنیت ولیقینا کمتر قومی است کہ از تاریخ ملی خود چنین روایت کامل زیبای داشتہ باشد ۔ "

نخستین منت بزرگی کہ فردوسی بر ما دار د احیا و القبالی تاریخ ملی ما است

هر چند جمع آوری این تاریخ رافردوسی نکرده و عمل او تنها این بوده است که کتابی راکه پیش از رو فراهم آمده بنظم آورده است واین همیں رو کافی است که او رازنده کننده آثار گذشته ایرانیان شمار آورد چنانچه خود او نکته را متوجه بوده وفرموده است

عجم زنده کردم بدین پارسی

وبس از شماره اسامی بزرگانی کدم نام آنها جرید نو بجا ساخته میگوید

چو عیسی من این مردگان را تمام

سراسر همه زنده کردم بنام

یورپ کی کئ محققوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ فردوسی کا بیان ایرانی تاریخوں سے حرف بہ حرف مطابق ہے ۔ شاہنامہ کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ فردوسی کو اپنی تاریخی ذمہ داری کا اس قدر لحاظ ہے کہ وہ واقعات کے بیان میں سب سے پہلے اپنا ماخذ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہے ۔ چنانچہ اس نے خود واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ شاہنامہ کی اصل بنیاد ایرانی قدیم تاریخ ہے ۔ شاہنامہ کے تمام ماخذ یکساں اہمیت نہیں رکھتے ۔ یعنی بعض زیادہ مستند ہیں اور بعض اس سے کم اور بعض اس سے بھی کم اس لئے فردوسی نے اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھا ہے ۔ اس سے ہٹ کر جو واقعات لکھے ہیں ۔ اکثرو بیشتران کے ماخذ کی بھی تصریح کرتا گیا ہے ۔ مثلاً شفاء کی داستان میں لکھتا ہے کہ وہ اس نے خود اس خاندان کی ایک زندہ یادگار سے حاصل کی تھی ۔ طلحہ و گیسوؔ کی داستان اصل ماخذ میں نہ تھی اس لئے اس کے راوی کا نام تصریح سے بتادیا ہے ۔

چنین گفت فرزانہ شاہوئے پیر

زشاہوئے پیر ین سخن بادیگر

جو واقعات پورے ملے ہیں ۔ ان کو من وعن مکمل طور پر ادا کیا ہے ۔ فردوسی کے عہد تک تاریخ نگاری کا یہی انداز غالب ہے ۔ کیکاوس اور خسرو کے زمانے تک کے جو حالات عام طور پر دوسری تاریخوں میں بھی ہیں ۔ ان میں بھی رزم وجنگ کے سوا کچھ بھی نہیں جس قدر زمانہ گذرتا گیا اور حالات کی آمیزش ہوتی گئ ۔ تاریخ کا تصور بھی بدلتا گیا اور چونکہ نوشیروان قریب

العہد تھا اس لیے ہر قسم کے ملکی انتظامات وغیرہ کی تفصیل زیادہ ملتی ہے اور فردوسی نے بھی ان کو مفصل لکھا ہے۔ فردوسی کا تاریخ کا تصور اس کے عہد کے تمام مورخین کے مقابلہ میں زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے جس کا اندازہ ہم کو خود شاہنامہ کی داستانوں سے ہوتا ہے کہ ہر داستان کے ذکر میں فردوسی نے اس کے راوی کا حوالہ دیا ہے اور حتی الامکان اس امر کا خیال رکھتا نظر آتا ہے کہ اس راوی کے حوالہ سے داستان لکھے جو حقیقت سے قریب تر یا سچا ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ کو اگرچہ ایک پائے تخت کے مورخ کی حیثیت سے لکھا ہے تاہم واقعات کے بیان میں اس کے اپنے قومی جذبات کی جھلک نمایاں ہے جو قدیم ایرانی شاہوں کی تاریخ کا بھی جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ قومی پاسداری کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایران کا اصل مقابلہ توران سے ہے۔ اس لئے تورانی یا تو مغلوب ہوتے ہیں یا اتفاقیہ فتح پاتے ہیں تو گردش زمانہ کا اثر ہوتا ہے۔ عرب کا ذکر شاہنامہ میں اکثر آیا ہے۔ لیکن ایک بھی موقعہ نہیں جو عرب کی تحقیر سے خالی ہو۔ فریدون اپنے بیٹوں کی شاہ یمن کی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتا ہے شاہ یمن کو دل سے منظور نہیں لیکن فریدوں اس کے آگے سرتابی نہیں کر سکتا۔ شاہ نامہ کے جمع کرنے کی تاریخ کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ پہلے کیومرث کا ذکر کرتا ہے جو اولین داستانی بادشاہ ہے۔ شاہنامہ کے آخر تک پچاس بادشاہوں کے نام آتے ہیں۔ اور ان کے دور کے حالات وزیروں اور پہلوانوں کا ذکر رزم وبزم کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں یہ طویل نظم عربوں کے ہاتھوں ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم کی شکست اور ایران پر عربوں کے قبضہ پر ختم ہوجاتی ہے۔ تاریخی وقائع کے لحاظ سے شاہنامہ گویا پچاس فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل ایک بادشاہ کے لئے مختص ہے۔ کیومرث سے لیکر منوچہر کی بادشاہی تک انسانی تمدن، کھیتی باڑی، کھانا کھانے کے آداب، کپڑے پہننے، مکان بنانے اور متمدن زندگی کی دوسری ضرورتوں کے رواج پانے کا بیان ملتا ہے۔ اسی حصہ میں ضحاک کاوہ وفریدون کی داستان آتی ہے۔ منوچہر کے زمانے میں سام پیدا ہوتا ہے۔ ژال دنیا میں آتا ہے اس کا بیٹا رستم پیدا ہوتا ہے۔ منوچہر کا بیٹا نوذر سات سال حکومت کرنے کے بعد تورانیوں کے بادشاہ افراسیاب کے ہاتھوں قتل ہوجاتا ہے۔ سہراب رستم کے لڑنے کا دردناک واقعہ اور

سہراب کا مارا جانا اسی دور میں پیش آیا۔ ایران اور توران کے درمیان جو جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے کئی جنگوں میں رستم نے حصہ لیا، آخر کار کیخسرو کے زمانہ میں افراسیاب گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اس آخری دور کی اہم ترین داستان بیژن و منیژہ کے عشق کی داستان ہے۔ گشتاسپ کے زمانے میں ایران باستان کا سب سے بڑا پہلوان رستم جو فردوسی کا ہیرو ہے دنیا سے اٹھ جاتا ہے فردوسی کو رستم سے بہت محبت ہے۔ دارا کے دور کے ساتھ سکندر کی داستان شروع ہو جاتی ہے اور غیر ایرانی ماخذوں سے لی گئی ہے۔ اشکانیوں کا حال نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر ساسانیوں کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں اس عہد کے اہم تاریخی واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ غرض کہ شاہنامہ قبل اسلام تاجداران عجم کے چار خاندانوں کی اچھی تاریخ ہے۔ پیشدادی، کیانی، اشکانی اور ساسانی، خاص طور پر شاہنامہ کا حصہ جو ساسانی عہد سے متعلق ہے۔ تقریباً پورا تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ غرض کہ فردوسی نے اپنے خون جگر سے ایران کی یہ بسوط تاریخ نظم کی جو تقریباً ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ بقول محمد علی فروغی فردوسی ایران کی قدیم تاریخ کا احیاء کرنے والا ہے۔ اگر فردوسی اپنے دل نشین انداز میں یہ داستانیں قلمبند نہ کرتا تو آج کوئی بھی ایرانی سورماؤں اور ایرانی بادشاہوں کی تاریخ نہ جانتا کیوں کہ اس سے پہلے جو تاریخیں لکھی گئیں تھی وہ یا تو پہلوی میں تھی یا پہلوی سے عربی ترجمے جن کو کوئی ذوق و شوق سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ شاہنامہ کے موثر انداز ہی کا اثر ہے کہ اس کو ہزاروں لوگوں کی زبانوں پر چڑھایا اور آج بھی لوگ بڑے فخر سے اس کو پڑھتے ہیں۔ علامہ شبلی نے شاہنامہ کو قدیم ایران کی ایک اچھی انسائیکلوپیڈیا کہا ہے جو شاعرانہ انداز میں ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ بے شک شاعر نے تاریخی غلطیاں بھی کی ہیں۔ اور کچھ ایسے واقعات بھی قلمبند کر دئے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن باوجود ان کے ہم کو جتنے تاریخی معلومات شاہنامہ سے حاصل ہوتے ہیں خود ایرانیوں کی کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ زمانہ کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے جو نمونے ہمیں شاہنامہ میں دکھائی دیتے ہیں وہ بہت کم کہیں اور دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا تنوع اور مختلف جگہوں کے واقعات او حالات ساتھ ہی انسانی زندگی کے مختلف رشتوں اور جذبات و احساسات کا بیان جیسے عشق

ومحبت، غم وغصہ وغیرہ ان سب چیزوں نے مل کر شاہنامہ کو بہت ہی دلچسپ کتاب بنا دیا ہے یوں تو شاہنامہ کا ہر شعر زبان وبیان کے لحاظ سے شستگی رکھتا ہے۔ لیکن واقعات کے بیان میں فردوسی نے جو کمال دکھایا ہے۔ وہ یقیناً اسی کا حصہ ہے۔ وہ تنہا شاعر ہے جس نے واقعہ نگاری کو محاکات کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ جذبات نگاری میں بھی اس کو مہارت حاصل ہے لیکن اس میں نظامی جیسی گہرائی نہیں۔

شاہنامہ میں جہاں رستم کا ذکر آتا اور اس نے عورتوں کے رتبہ کا معیار بلند قائم کیا ہے۔

وحکمت میں "عدیم القرین" لکھا ہے۔

خیام فلسفہ یونان کا درس دیتے تھے۔ اس کا اثر لوگوں کے اسلامی عقائد پر پڑا۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیام کو بے دین قرار دیا۔ جس پر انہوں نے مجبوراً زبان و علم
کو ایک عرصہ کے لئے تھام لیا۔ چونکہ لوگوں نے ان کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ حج کو
روانہ ہوگئے۔ واپسی میں جب بغداد پہنچے تو لوگ ہر طرف سے آنے لگے۔ تاکہ علم فلسفہ سیکھیں
لیکن خیام نے انکار کر دیا حج سے فارغ ہو کر وطن آئے اور عبادت میں مصروف ہوگئے۔

لغات اور ادبیات عربی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں
فردوس التواریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ابوالحسن بیہقی اور خیام کے درمیان
دیوانہ حماسہ کے ایک شعبہ پر بہت طویل بحث ہوئی۔ جس سے ادب عربی میں ان کے علمی
مراتب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حکیم صاحب کی قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ اصفہان کے مقام پر آپ نے ایک کتاب کو
ساٹھ مرتبہ پڑھا اور جب نیشاپور واپس آئے تو پوری کی پوری کتاب زبانی لکھوا دی۔ صرف
چند الفاظ کا فرق تھا۔ فلکیات میں بھی خیام کو خاص مہارت حاصل تھی۔ نظامی عروضی
سمرقندی لکھتا ہے کہ ۵۰۸ھ کے موسم سرما میں بادشاہ نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن
المظفر کے پاس مرو میں قاصد روانہ کیا کہ خیام سے استفسار کرے کہ وہ اعمال نجوم کے ذریعہ
کوئی ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو۔ خیام نے دو دن تک اس معاملہ پر
غور و فکر کر کے دن مقرر کر دیا۔ بادشاہ شکار کے لئے روانہ ہوا ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ
بادل اٹھے اور برف گرنی شروع ہوئی لوگوں نے اس پر خیام کی ہنسی اڑائی اور چاہا کہ واپس
ہو جائیں لیکن خیام نے کہا کہ ابھی بادل رک جائیں گے اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی
ان کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور لوگوں نے پانچ دن تک بادل کی شکل بھی نہ دیکھی۔

افسوس ہے کہ خیام کے علمی کارنامہ باقی نہ رہے چند تصانیف جن کا ابھی تک پتہ چلتا
ہے وہ تقویم جلالی ارلج ملک شاہی، عرائس النفائس، الجبرا بزبان عربی، علم طبعیات میں ایک
رسالہ، ایک مختصر رسالہ "درباره حکمت الخالق فی خلق العالم خصوصا الانسان وتکلیف الناس

بالعبادات" یہ رسالہ مصر میں چھپ گیا ہے اور ایک رسالہ بھی مصر میں چھپ گیا ہے۔

خیام کے دربار شاہی سے تعلقات کے متعلق شبلی لکھتے ہیں۔" سلاطین و امراء اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا ملک شاہ سلجوقی دنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا، اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن شہزوری کی تاریخ الحکماء میں لکھا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ شہزوری نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ جس زمانہ میں سنجر شہزادہ تھا اس کو چیچک نکلی خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا۔ وزیر نے خیام سے پوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے؟ خیام نے کہا آثار اچھے نہیں۔ یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی۔ اس کو نہایت رنج رہا سو کبھی دور نہ ہوا۔

خیام صاحب اولاد تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے" نسب شاہ نور الحکیم عمر خیام می رسد" (شاہ نور کا نسب خیام سے تعلق رکھتا ہے۔)

خیام کی صفات کے متعلق ایک عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز آپ بو علی سینا کی کتاب " الشفاء " کا مطالعہ کر رہے تھے جب وحدت و کثرت کی بحث پر پہنچے تو کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نماز پڑھی اور یہ کہتے ہوئے جان دے دی کہ " اے خدا! میں نے تجھ کو اپنی طاقت کے مطابق پہچاننے کی کوشش کی تو مجھے بخش دے کیونکہ تیرے متعلق میرا جتنا علم ہے میری طاقت کے مطابق انتہا ہی ہو سکتا تھا۔" تاریخ وفات ۱۵۷۰ء بتائی جاتی ہے۔

کلام:۔ ! حکیم صاحب کی شاعری کا تمام تر سرمایہ ایک مجموعہ رباعیات ہے جو افق مشرق و مغرب پر ماہ کامل کی طرح درخشاں ہے۔ سوائے ایک قطعہ کے اور کوئی فارسی نظم ان کی یادگار اس وقت موجود نہیں یا تو سوائے رباعی کے انہوں نے کچھ لکھا ہی نہیں یا باقی تصانیف کسی طرح جو تھوڑا بہت لکھا بھی تھا زمانہ کی دستبرد سے تلف ہو گیا۔ البتہ عربی زبان میں بہت شعر لکھے ہیں۔

خیام نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے رباعی ہی کو منتخب کیا۔ اس زمانہ میں رباعی کا رواج بھی زیادہ تھا۔ ان سے پہلے رباعی گو شعراء میں شہید بلخی، ابو سعید ابوالخیر، رودکی،

ابو شکور بلخی گذرے ہیں لیکن ان سب کے مقابلہ میں صرف خیام ہی کی رباعیات مشہور و مقبول ہوئیں ۔ ان کی رباعیات میں گلاب کی رنگینی شنبم کی نزاکت اور قوس قزح کی مسکراہٹیں جمع ہیں بعض وقت سادگی اور انداز بیان سے بلندی مطالب کے متعلق غلط فہمی ہوتی ہے ۔ غور سے مطالعہ کیا جائے تو پڑھنے والا خود کو فکر و نظر کی دوسری دنیا میں پاتا ہے ۔

خیام کی رباعیات اگرچہ سینکڑوں ہیں لیکن سب کی قدر مشترک صرف چند مضامین ہی ہیں ۔ دنیا کی بے ثباتی، خوشدلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر و قدر، توبہ و استغفار ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے ۔ لیکن ہر دفعہ کچھ اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ روح تو وہی رہتی ہے پیکر کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔

ہم کیا ہیں ؟ کیوں ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ کہاں جانا ہے ؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو کسی فلسفی سے حل نہ ہوسکے اور کسی نکتہ رس کے ناخن تدبر نے اس گرہ کو نہ کھولا ہو اور آخر کار سب کو یہی کہنا پڑا " معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد " اس حیرت خانہ میں آکر فلسفی سرگردان ہوجاتا ہے ۔ خیام تو حکیم بھی تھے اور فلسفی بھی ۔ تمام عمر یہی سونچا کئے ۔ میں کیا ہوں ؟ میری ابتداء کیا ہے اور انتہاء کیا ہے ؟ کبھی کہتے ہیں ہم جس دور میں آتے اور جاتے ہیں ہمیں اس کا آغاز معلوم ہوتا ہے نہ انجام ۔ کوئی شخص یہ بیان نہ کرسکا کہ ہم کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں ۔ یعنی پردہ اسرار میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ۔ اس معمہ سے کوئی واقف نہیں اور انسان کی مستقل رہائش خاک کے اندر ہے لیکن افسوس کہ یہ فسانہ طویل ہے ۔

در پردہ اسرار کسی راہ نیست
زیں بقیہ جاں ہیچ کس آگاہ نیست

جز در دل خاک ہیچ منزلگاہ نیست
افسوس کہ ایں فسانہ ہم کوتاہ نیست

اجرام فلکی اور کائنات کی تخلیق کے متعلق کہتے ہیں ۔

آغاز دوان گشتن ایں زریں مماس
وانجام خرابی چنیں نیک اساس

دانستہ نمی شود بمعیار عقول
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس

ازل کے اسرار کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کو نہ تو جان سکتا ہے اور نہ میں یہ معمہ نہ تیری سمجھ میں آسکتا ہے نہ میری سمجھ میں۔ من وتو کی باتیں پردے کے باہر کی باتیں ہیں جب پردہ اٹھ جائے گا تو نہ تو باقی رہے گا اور نہ میں

اسرار ازل را نہ تو دانی ونہ من
این حرف معمہ نہ تو خوانی ونہ من

ہست از پس پردہ گفتوئے من وتو
چون پردہ برافتد نہ تو مانی ونہ من

الہیات میں تمام عمر غور وفکر کرنے کے بعد انسان کو آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے ہم پوری طرح جیسا چاہیے تھا تجھے نہ پہچان سکے کہتے ہیں۔

کس را پس پردہ قفا راہ نہ شد
درسر خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد

ہر کس نہ سر خیال چیزی گفتند
معلوم نہ گشت وقصہ کوتاہ نہ شد

یعنی اسرار الہیٰ سے کوئی شخص واقف نہ ہوسکا ہر ایک اپنی عقل کے مطابق کچھ نہ کچھ کہدیتا ہے۔ لیکن حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی۔

خیام نے مسئلہ وحدت الوجود کی ایک نئی ہی تعبیر کی ہے۔ کبھی کہتے ہیں تمام عالم ایک شخص ہے۔ خدا اس کی روح ہے فرشتے اس کی حسین ہیں اور باقی کائنات اس کے اعضاء۔ کبھی خدا کو جہاں کی جان اور کبھی خود کو جہاں کی جان کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میں اور تو پرکار کا نمونہ ہیں۔ ہمارے سر علحدہ ہیں لیکن جسم ایک دائرہ کی طرح ہم ایک نکتہ پر رواں ہیں۔ آخر کار ہم پھر مل جائیں گے۔ کبھی کہتے ہیں خدائے حاضر وناظر کا میں ہی مظہر ہوں اس لیے تیرا مسجود ہوں۔

درمن کہ زچہ روئی گشتہ ساجد ما
بت گفت بہ بت پرست کاے عابد ما
بر ما جمال خود تجلی کردہ است
آنکس زتست ناظر وشاہد ما

اس میں شک نہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے دل میں عشق رکھتا ہے اور محبوب حقیقی کے ہجر میں ہمیشہ تڑپتا و مضطرب رہتا ہے۔ حیوانات کے دل اگر اس کے عشق سے مخمور ہیں جمادات و نباتات بھی اس طرح سے عاری نہیں سکتے ہیں کہ چاند و سورج کو ہر شخص سمجھ رہے کہ صرف اپنے ہی پاس ہے لیکن در حقیقت وہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس طرح محبوب حقیقی کو ہر شخص صرف اپنا ہی سمجھتا رہے لیکن وہ تمام عالم کا معشوق کبھی کہتے ہیں کہ محبوب حقیقی کے عشق کے سورج نے تو ہر ایک ذرہ کے ہاتھ میں چراغ دیا ہے کبھی کہتے ہیں کہ کوئی ایسی جگہ نہیں جو محبوب حقیقی کے مذاق سے خوں نہ ہو۔ کوئی صاحب نظر ایسا نہیں جو اس کا شیدا نہ ہو اس لئے کہ تجھے کسی کا سودا نہیں۔ پھر بھی ایسا کوئی سر نہیں جس پر تیرا سودا نہیں۔

پر خون زفرقتت جگر نیست کہ نیست
شیدائے تو صاحب نظری نیست کہ نیست
باآنکہ نداری سر سودائے کسے
سودائے تو ہیچ سرنیست کہ نیست

خیام کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا بہت اثر تھا۔ ہستی مستعار کا یہ پہلو ہمیشہ ان کے سامنے رہا۔ اس مضمون پر ان کے رباعیات کی کثرت اس کا صاف پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں سکتے ہیں کہ مرنے کے بعد شاہ و گدا میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ دونوں کی مٹی یک جا گوندھی جاتی ہے اور اس سے ساغر بنتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں یہ پرانا سرائے جس کا نام دنیا ہے اور جو ابلق صبح و شام کی آرام گاہ ہے۔ یہ ایسی بزم ہے جس میں صد جمشید آئے اور چلے گئے اور ایک ایسا قصہ ہے جو کئی بادشاہوں کا تکیہ گاہ رہ چکا ہے۔

ع این کہنہ رباط راکہ عالم نام است
آرامگہ ابلق صبح وشام است
بزمیست کہ وامانده صد جمشید است
قصریست کہ تکیہ گہ صد بہرام است

حکیم صاحب شاعر تھے انہیں واعظوں سے نفرت ترکہ میں ملی تھی ۔ کہتے ہیں۔

اے خواجہ یکی کار روا کن مارا
دم درکش و در کارخدا کن مارا
ما راست رویم لیک تو کج مابینی
رو چارہ دیدہ کن رہا کن مارا

سچے دوستوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے اور ہر زمانہ کے لوگ اپنے دوستوں کی بے وفائی کی شکایت کرتے آئے ہیں ۔ خیام یوں رقم طراز ہیں ۔

شد دعوی دوستی دریں دیر حرام
الفت زبد کردی کہ دوست کدام
دامن زہمہ کشیدن اولی باشد
از دور بہر یکی سلام است وکرام

عاشق خدا کو یہ جواب دیتا ہے کہ اگر مجھے عشق سے منع کیا ہے ۔ دنیا میں حسن کیوں پیدا کیا ۔ خیام بھی کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے محبوب کو اتنا خوبصورت بنایا اور مجھے حکم دیتا ہے کہ اس کی طرف نہ دیکھ جب میں گوشہ عدم میں سویا ہوا تھا تو نے حکم دیا کہ اٹھ جہاں میں جا اور شور پیدا کر میں نے تیرے حکم کے مطابق عمل کیا ۔ اب اس پر حیران ہوں ۔

شعرا ہمیشہ آسمان کی سفلہ پروری کی شکایت کرتے آئے ہیں ۔ خیام کا بھی خیال اس

اے دہر بہ کردہ ہائے خود معترضی
در خانقہ جور وستم معتکفی

نعمت بجناں دہی وہ رحمت بکساں

زین ہر دو برون نیست دری یا خضری

خیام عیش امروز کو غم فردا پر ترجیح دیتے ہیں اور وہ شراب کو اندوہ ربا تصور کرتے ہیں کہتے ہیں کہ دل میں غم کا پودا نہیں لگانا چاہیے دنیا کا غم فضول ہے عقل مند آدمی دنیا کا غم نہیں کھاتا۔ بلکہ اس کی آگ کو شراب سے بجھاتا ہے کہتے ہیں۔

می خور کے مدام راحت روح تو است
آسائش جان ودل مجروح اوست

طوفان غم از دلبر آیداز پیش ست
دربادہ گریز کشی نوح تو است

خیام نے جہاں رباعیات میں رندانہ مضامین باندھے ہیں۔ وہیں حکمت واخلاق کے صدہا نایاب موتی بھی پروے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ مصیبت زدہ ہیں ان کی طرف دیکھ اور اللہ کا شکر بجالا۔ تکلیف میں صبر کر اور خوش رہ۔ انسان کو نفسانی خواہشات میں مبتلا نہ رہنا چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں کس لئے بھیجا گیا ہے۔ نفس کو کتا کہا ہے۔ دنیا کا یہ حال ہے کہ اپنے عیبوں پر تو کسی کی نظر نہیں اور دوسروں کی عیب جوئی کی جاتی ہے حکیم صاحب نے غفلت کو ترک کرنے اور عمل کی تلقین کی ہے وہ مادی چیزوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ نااہل دوست کی دوستی کو مذموم حرکت قرار دیتے ہیں۔ خوشامد کو زہر تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جب تک جان میں جان ہے خدا پر توکل کرو نہ دشمن سے ڈرو نہ دولت کے دست نگر رہو۔ دنیا میں عجز وانکساری کے ساتھ گوشہ گمنامی اختیار کرو۔ خود پسند نہ بنو۔ خیام نے بلند مرتبہ ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری خیال کی ہیں۔ ایک انسان کم آزار ہو دوسرا موت سے نہ ڈرو۔ تیسرا یہ کہ روزی کے لئے سرگرداں نہ ہو۔

خواہی کہ ترا رتبہ ابرار رسد
مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد

از مرگ میندیش و غم رزق مخور
پس ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

حصول مراد میں تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں اور کرنی چاہیے۔ انسان دوسروں کا انجام دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔ کہتے ہیں تیری ابتدا بھی عدم انتہا بھی عدم اس چند روزہ زندگانی میں تو کیا کچھ کرے گا۔ جن مضامین میں انسان ماہر نہ ہو اس کے بارے میں زبان نہ کھولے۔ احسان کی ترغیب دی ہے۔ اگر دوسروں سے نیکی کا سلوک کرے تو انجام بخیر ہوگا۔ دنیا کی سب چھوٹی بڑی چیزیں فانی ہیں۔ دنیا میں جس چیز سے زیادہ محبت ہو وہی زیادہ باعث تکلیف ہے اگر کوئی دوسروں کو ناخوش کر کے خود خوش ہونا چاہتا ہے تو وہ بڑا نادان ہے۔

یہ جانتے تھے کہ باغ دنیا کی بہار چند روزہ ہے عہد خزاں میں باد صرصر کے جھونکے آخر کار اس گلشن کی شادابی کا خاتمہ کر دیں گے۔ خیام کے اس کلام موضوع پر اس قدر ہیں کہ کسی شاعر کے کلام میں اس کا اعادہ اس کثرت کے ساتھ نہیں رکھتے ہیں۔

آمد سحر ندا از میخانہ ما
کای رند خراباتی دیوانہ ما

بر خیز کہ پر کنیم پیمانہ ما
زاں پیش کہ پر کنند پیمانہ ما

کہتے ہیں کہ وقت کے ایک لمحہ کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسے غنیمت سمجھو اور خوشی سے گذارو۔ چاندنی رات میں شراب پیو کہ اس سے بہتر وقت کوئی نہیں۔ وہ خوشگوار لمحوں میں جب کہ چاندنی رات ہو یا موسم گل و روز ابر ہو۔ جو شراب اور نگار کا ساتھ ڈھونڈتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کو معطل نہیں رہنا چاہیے۔ یا تو عبادت الہیٰ میں مشغول ہو جائے یا عیش و عشرت میں محو۔

مہتاب ہنوز دامن شب بشگافت
مئ خور کہ دمی خوشتر ازاں نتواں یافت

خوش باش و پیندیش که مہتاب ہی
اندر سرخاک یک یک خواہد تافت

شراب کے متعلق لکھتے ہیں کہ شراب پی حیات جاوداں یہی ہے۔ شراب آب حیات ہے مٹی پہ ڈالو تو زندہ ہوجاتی ہے شراب اس لئے تلخ ہے کہ میری زندگی ہے کیونکہ میری زندگی ہمیشہ تلخ رہی ہے۔

امروز کہ نوبت جوانی من است
می نوشم از آن کہ کامرانی من است

عیبش مکنید اگرچہ تلخ است بس است
تلخ است از آنکہ زندگانی من است

خیام شراب حکیمانہ انداز سے پیتے ہیں۔ انہوں نے مے نوشی کے لئے تین ضابطے مقرر کئے ہیں۔ شراب کس کے ساتھ پینی چاہیے؟ کب پینی چاہیے؟ کتنی پینے چاہیے؟ فرماتے ہیں۔

گر بادہ خوری تو بہ خرد مندان خور
یا باصنم لالہ رخ وہ خنداں خور

بسیار مخور ورد مکن فاش مساز
اندک خور و گہ خور و پنہاں خور

عشق عاشق کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے عاشق کو چاہیے کہ ہمیشہ شیدا رہے۔ دیوانہ و شوریدہ رہے۔ مستان عشق عقل کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ عقل ان کی پیروی کرتی ہے۔ عشق کی بدمستی کو عقل کی ہوشیاری سے بہتر بناتے ہیں۔

توبہ اور استغفار ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن خیام اس کو جس طرح بیان کرتا ہے سننے والوں کے دلوں کو تڑپا دیتا ہے اور ان کے چشم گریاں ہوجاتے ہیں بعض جگہ ایسی دلیلیں دیکر دعاء مانگتے ہیں جس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ مغفرت کی دعاء مانگتا ہے۔ لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے۔ توبہ و گناہ کا اعتراف دیکھئے کس شان سے کرتا ہے۔

یا رب اگر من گناہ بیحد کردم
برجان وجوانی وتن خود کردم

چوں برکرمت وثوق کلی دارم
برگشتم وتوبہ کردم و بد کردم

مشہور ہے کہ ایک دن خیام کی صراحی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی اس نے رباعی لکھی۔

ابریق مئے مرا شکستے ربی
برمن در عیش را بربستی ربی

برخاک بریختی مئ گلگوں مرا
خاکم بدہن کہ سخت مستی ربی

کہتے ہیں اس گستاخی پر ان کا چہرہ سیاہ ہو گیا انہوں نے پھر مندرجہ ذیل رباعی پڑھی۔ جس کے بعد ان کا چہرہ دوبارہ نورانی ہو گیا۔

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو
وآں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو

من بدکنم وتوبد مکافات دہی
پس فرق میاں من وتو چیست بگو

خیام کے کلام کی عظمت، شیرینی اور ہمہ گیری کا اندازہ نقادوں کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ فارسی زبان کو غیر زبان والے اس لئے پڑھتے ہیں کہ گلستان سعدی، شاہنامہ فردوسی، دیوان حافظ اور رباعیات خیام کا مطالعہ کریں ان کی درخشاں روشنی میں اپنی حیات کا تابناک لائحہ عمل تجویز کریں۔

سعدی شیرازی

اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سمیع الدین احمد کی کتاب نقد ادبیات فارسی کے دیباچہ میں سعدی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"فارسی زبان وادب میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ان کا شمار صف اول کے شاعروں کے علاوہ صف اول کے نثرنگاروں میں بھی کیا جاتا ہے۔انگریزی، عربی اور اردو زبانوں کی طرح فارسی میں بھی دو طرح کے اسالیب کا چلن رہا ہے یعنی ایک مرصع اور مزین اور بلند آہنگ اسلوب اور دوسرا سادہ بے میل تصنع اور عبارت آرائی سے مستثنیٰ اسلوب۔انگریزی میں سرٹامس براون اور عربی میں مقامات حریری اور کلیلہ و دمنہ کے مصنفین کا انداز نگارش اور اردو میں رجب علی بیگ سرور اور غالب اور حالی دونوں انداز کے نمایندے کہے جاسکتے ہیں۔سعدی دوسری قسم کے نثرنگاروں کے زمرے کے سرخیل کہے جاسکتے ہیں۔ان کی نثر میں حلاوت، دلآویزی اور برجستگی ہے۔ان کی شاعری ونثر دونوں میں تنوع اور گوناگوں تجربات کی کشید ملتی ہے۔انہوں نے زندگی اور زمانے میں اپنی بصیرتوں کو اپنے خون میں حل کر کے انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔سعدی کی شاعری اور نثر کا مابہ الامتیاز عنصر وہ دانائی ہے جسے تجربات زندگی کا عطر کہا جاسکتا ہے۔یہی ان کی تحریروں کو جلا بخشتا ہے۔اور یہی ان کی آفاقیت پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ان کے یہاں عبارت کی گراں باری نہیں ہے۔بلکہ الفاظ ایسے صاف وشفاف ہیں کہ ان کے اندر سے مفہوم کی وسعت اور گیرای دمکتی ہے اور وہ انشراح قلب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔"

ملک الشعرا بہار مشہدی نے جامع الفاظ میں ان کی بڑائی کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"----- سعدی بزرگتر از آنست کہ لازم باشد در تعریف وی صرف وقت کنیم ، چہ دفتری نیست کہ از ذکر جمیل و شرح احوال بزرگواری خالی باشد"
(سبک شناسی، ج ۳ صفحہ ۱۱۱)

حیات سعدی میں حالی نے بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول و مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رتبہ کو نہیں پہنچا" (حیات سعدی لاہور ۱۹۳۸ اڈیشن صفحہ ۶)

علی دشتی لکھتے ہیں:-

"جنبہ ھائی گوناگوں سعدی نگارش در بارہ وی را دشوار می کند" (قلمرو سعدی صفحہ ۱۷)

دکتر ذبیح اللہ صفا، استاد ممتاز دانش گاہ تہران نے سعدی کے نام و نسب اور تاریخ وفات کے بارے میں جو مختلف اقوال ملتے ہیں ان کا ذکر ضمناً کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"در نام و نسب و تاریخ وفات این استاد بزرگ میان نویسندگان و مولفان قدیم اختلافست و گمان می رود کہ علۃ العلل این اختلاف امری جز کثرت شہرت سعدی و افتادن نام بلندش در افواہ خواص و عوام نیست ۔ بنابر آنچہ از تحقیق در ماخذ موثق قدیم برمی آید نام و نسب درست او ہمانست کہ در آغاز این مقال آوردہ ام اما اگر نجواھیم بسیری در ماخذ مختلف درین باب پردازیم واقعاً دچار حیرت و سرگردانی می شویم ---" (تاریخ ادبیات در ایران جلد ۳ بخش اول صفحہ ۵۸۶)

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب نقد ادبیات فارسی کے (صفحہ ۱۱) پر سعدی کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں ۔ شیخ نے اپنی تخلیقات کا جو نثری و شعری سرمایہ چھوڑا ہے ، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سادہ نگاری کے ذیل میں آتا ہے ۔ اور اس کے گرد اشکال و اخلاق اور بلاغت کے دبیز پردے حائل ہیں اور یہ سرمایہ بیشتر حکایتوں اور سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے ۔ لہذا

اس تخلیق کے پس منظر میں ان کو یا ان کے ادبی کارناموں کو سمجھ لینا بظاہر کوئی مشکل امر نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہی سادگی اور سادہ نویسی ان کے افکار و معانی کے ثروت و عمق کا پتہ دیتی ہے۔ جتنا کھنگالیے اور تلاش و جستجو سے کام لیجئے اتنے ہی لطائف معانی کے آبدار موتی ہاتھ آتے ہیں۔

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب "نقد ادبیات سعدی" (دلی ۱۹۸۴ء صفحہ ۲۰) پر لکھتے ہیں کہ "یہ بات اب آزادی تحقیق موثق داخلی شہادتوں کی روشنی میں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شیخ سعدی کی پیدائش ۶۰۶ھ کے حدود میں ہوئی اور چونکہ سال وفات یقینی طور پر ۶۹۱ھ یا ۶۹۲ھ ہے لہٰذا ان کی عمر پچاسی سال کے لگ بھگ ہوئی۔ چونکہ تحقیقی سطح پر ان تمام مسائل و مباحث کی چھان بین ہو چکی ہے اور یہ مصدقہ امور ہیں لہٰذا ان پر مزید اظہار خیال کی ضرورت نہیں" حالی نے اپنی کتاب حیات سعدی (۲۶۴) پر لکھا ہے کہ "اس کی عمر ایک سو دو برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔ کسی نے شیخ کی عمر ایک سو دو برس کسی نے ایک سو دس برس اور کسی نے ایک سو بیس برس لکھی ہے۔

سعدی کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص تھا۔ سر گور اوسلی نے اس کی ولادت ۵۸۹ھ ۱۳۳۲ء لکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے اتابک مظفر الدین شاہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ وہ ایک باخدا مرد تھا۔ شیخ کو بچپن ہی سے عبادت کا شوق تھا۔ سعدی کے باپ کا سایہ کمسنی میں سر سے اٹھ گیا تھا اس کی تربیت ماں نے کی سعدی نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ جم غفیر کا شہرہ جو خط فارس میں اہل کمال ہو کر گذرے تھے بزرگوں سے سنا تھا۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق ان کے دامن گیر ہوا۔

چونکہ شیراز میں اطمینان نصیب نہ تھا۔ سعدی نے ترک وطن کا ارادہ کیا شیخ نے ابن جوزی کے آگے نظامیہ بغداد میں زانوئے ادب تہہ کئے۔ سر گور اوسلی نے لکھا ہے کہ اس نے شیخ کی ایک نظم دیکھی ہے جس کو اٹھارہ مختلف ملکوں کی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ جہاں وہ

ں کو گئے تھے۔شیخ کی وفات ۶۹۱ھ میں ہوئی۔

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کی اصلی رائے
ے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا
نقل کیا ہے۔جس میں فردوسی کو مثنوی کا انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار
ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند
ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات وقصیدہ وغزل را
فردوسی ، انوری وسعدی

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی کو اپنی مثنوی نہ سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے
یگر اصناف سخن میں ان کو ترجیح دی ہے۔لیکن ایک شعر میں مطلقاً شیخ کے تتبع پر فخر کیا

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از میخانہ مستی کہ درشیراز بود

امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس زمانے کے اہل ذوق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ
ع پر افتخار کیا ہے۔

حسن گلی زگلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل معنی گلچیں ازیں گلستاں اند

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں ایک حکایت مشہور ہے کہ مشائخ وقت میں سے
رگ شیخ کے منکر تھے ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے
گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ان بزرگ نے پوچھا کہ
راہے؟ سعدی شیرازی نے کہا "ایک بیت سعدی شیرازی نے کہی ہے جو جناب الٰہی میں
ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے۔

سیاحی کو گئے تھے۔ شیخ کی وفات ۶۹۱ھ میں ہوئی۔

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں فردوسی کو مثنوی کا انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند
ھر چند کہ لانبی بعدی
ابیات وقصیدہ وغزل را
فردوسی ، انوری وسعدی

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی کو اپنی مثنوی نہ سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے لیکن دیگر اصناف سخن میں ان کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ایک شعر میں مطلقاً شیخ کے تتبع پر فخر کیا ہے۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از میخانہ مستی کہ درشیراز بود

امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس زمانے کے اہل ذوق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے۔

حسن گلی زگلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل معنی گلچیں ازیں گلستاں اند

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں ایک حکایت مشہور ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ سعدی شیرازی نے کہا "ایک بیت سعدی شیرازی نے کہی ہے جو جناب الہی میں مقبول ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے۔

اس تخلیق کے پس منظر میں ان کو یا ان کے ادبی کارناموں کو سمجھ لینا بظاہر
نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہی سادگی اور سادہ نویسی ان کے افکار و معانی کے
پتہ دیتی ہے۔ جتنا کھنگالیے اور تلاش و جستجو سے کام لیجئے اتنے ہی لطائف معانی
ہاتھ آتے ہیں۔

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب "نقد ادبیات سعدی" (دلی ۱۹۸۴ء صف
ہیں کہ "یہ بات اب آزادی تحقیق موثق داخلی شہادتوں کی روشنی میں پایہ ثبوت
کہ شیخ سعدی کی پیدائش ۶۰۶ھ کے حدود میں ہوئی اور چونکہ سال وفات یقینی ط
۶۹۲ھ ہے لہذا ان کی عمر پچاسی سال کے لگ بھگ ہوئی۔ چونکہ تحقیقی سطح پر ان
و مباحث کی چھان بین ہو چکی ہے اور یہ مصدقہ امور ہیں لہذا ان پر مزید اظہ
ضرورت نہیں" حالی نے اپنی کتاب حیات سعدی (۲۶۴) پر لکھا ہے کہ "اس کی عم
برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔ کسی نے شیخ کی عمر ایک سو دو برس کسی نے ا
برس اور کسی نے ایک سو بیس برس لکھی ہے۔

سعدی کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص تھا۔ سر گور او
کی ولادت ۵۸۹ھ ۱۳۳۲ء لکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے اتابک
شاہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد
خدمت پر مامور تھا۔ وہ ایک باخدا مرد تھا۔ شیخ کو بچپن ہی سے عبادت کا شوق تھا۔
باپ کا سایہ کمسنی میں سر سے اٹھ گیا تھا اس کی تربیت ماں نے کی سعدی نے ہوش سن
شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر
سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ جم غفیر کا شہرہ جو خط فارس میں اہل کمال ہو کر
تھے بزرگوں سے سنا تھا۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق ان کے دامن گیر ہوا۔

چونکہ شیراز میں اطمینان نصیب نہ تھا۔ سعدی نے ترک وطن کا ارادہ کیا شیخ
جوزی کے آگے نظامیہ بغداد میں زانوئے ادب تہہ کئے۔ سر گور اوسلی نے لکھا ہے کہ
شیخ کی ایک نظم دیکھی ہے جس کو اٹھارہ مختلف ملکوں کی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے نامہ ایست معرفت کردگار

چمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ سعدی کے کلام کی بلاغت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے۔ چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی۔ اس لئے حسن ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے متاثر ہوئے ہونگے۔ بعض وجہ سے شکسپیر سے شیخ کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ مثلاً دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت و شوخی کی چاشنی پائی جاتی ہے دونوں کا بیان ہمیشہ صاف سادہ اور دلنشین ہوتا ہے۔ اور دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پند پر رکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتے ہیں۔ جس طرح شکسپیر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہیں اسی طرح سعدی کی گلستان کے بھی صدہا فقرے فارسی اور اردو زبان میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر اثر کیا تھا۔ ایشیا میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم کا چرچا ہے اور کسی کتاب کا نہیں۔

گلستان اور بوستان کو شیخ کے کلام کا لب لباب سمجھنا چاہیے۔ لاکھوں استادوں نے اسے پڑھایا اور چھ سو برس سے اس کی تعلیم ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں جاری ہے۔ مغرب کی اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ علما نے ان کی عزت کی بادشاہوں نے اس کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا۔ سر گور اوسلی لکھتا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو مشہور فاضل جینس نے لاطینی میں کیا تھا اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا۔ گلستان کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی۔ گلستاں کے ابواب کی عمدہ ترتیب۔ اس کے فقروں کی برجستگی۔ اس کے الفاظ کی شستگی اس کے استعارات کی جرأت اس کی تمثیلات و تشبیہات کی طرفگی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اس کی تصنیف پر صرف کیا۔ گلستان کے دیباچہ میں خود

سعدی نے لکھا ہے کہ

"میں نے عمر کا ایک بڑا حصہ اس پر صرف کیا ہے۔" اور اسی میں لکھتے ہیں کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اس کا لکھنا شروع ہوا تھا۔ وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی۔" شیخ نے جس فصل بہار کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ نے گلستان کے لیے جو سرمایہ جمع کیا تھا وہ پہلے سے اس کے پاس نامرتب تھا۔ جب وہ وطن پہنچا تو دوستوں کی تحریک پر اس کی ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اس کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہوئی۔

ان دونوں کتابوں گلستان و بوستان میں مبالغہ بہت کم ہے اور جہاں ہے وہاں نہایت بامزا ہے۔ اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں۔ مافوق العادات باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جس سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی و مشرقی ادب بھرا پڑا ہے ان کتابوں میں کم ہیں۔

ان دونوں کتابوں میں یہ بات تعجب انگیز ہے کہ باوجود یہ کہ صنائع لفظی اور معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً گلستان کا نصف حصہ مسجع و مقفیٰ ہے۔ بااینہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہے۔ اور یہ سعدی کے کمال انشاپردازی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

وہ اکثر نہایت پاکیزہ و لطیف نکتے جن سے انسانی ذہن خالی ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتے ہیں جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

نیچر کے بیان میں سعدی کا کلام واقعی لاثانی ہے۔ وہ اکثر قانون قدرت سے اشیا کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے۔ اور یہ زیادہ دلنشین اور عام فہم ہوتا ہے۔ وہ اکثر آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے۔ جس کو زاہد و رند دونوں پسند کرتے ہیں۔

گلستان اور بوستان میں شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور ان سے نتائج استخراج کیے ہیں اس لیے اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان ان کو بیان کرتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بیان کی طرف لوگوں کے دل کھنچتے ہیں اس کے کلام میں ایسا مزہ ہوتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے

آتی ہے اور نہایت رغبت و شوق سے کھائی جاتی ہے۔

غزلیات:۔ سب میں پہلے غالباً شیخ ہی کا دیوان موجودہ طرز پر مدون کیا گیا ہے۔ان کے چار دیوان ہیں۔جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ "طیبات" ہے۔شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے "نمکدان شعرا" لکھا ہے۔اگر چہ اس سے پہلے انوری وقاآنی کی غزلیات موجود تھیں ان کے دیوان میں چند چیزیں ایسی ملتی ہیں۔جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں ہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں۔یہی وہ خصوصیتیں ہیں جو غزل کو نہایت بامزا اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام بناتی ہیں۔

شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتے ہیں جو تغزل اور تفنّن کے واسطے بہت مناسب رہتی ہے۔اسی لئے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی ابن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے بیالیس برس بعد اس کا کلام جمع کیا، اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی۔

نظر خدائے بیناں زسر ہوا نباشد

سفر نیاز مندآں زرہ خطا نباشد

اس غزل کو سن کر مجلس کے خاص و عام جابجا بے ہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخواست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدت عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔

شیخ کی غزل کو جبلی عشق و محبت نے جو اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق وصل وجدائی۔یاس و امید۔صبر و مجبوری وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے ان میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اس عالم میں ہر شخص پر گذرتی ہیں۔اسی واسطے عشاق کے دل پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

مقدار یار ہم نفس چوں من نداند ہیچ کس

ماہی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را

اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقعہ ہے اور وہاں جو حالت اس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا کیفیت اس کے دل پر گذری ہے بیان کرتا ہے۔

اے ساربان آہستہ راں کا رام جاں در محمل است
اشتراں را بار بر پشت ست وما را بردل است

وہ اکثر حالات واردات کو جو اس کے دل پر گذرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔شیخ کے کلام میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے۔جس سے قدماء کی غزل معرا ہے۔وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر کے ایسے خوش نما انداز میں بیان کر دیتا ہے۔جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوش نما اور گراں بہا بنا دیتا ہے

خلق را بیدار باید بود زاب چشم من
وین عجب کان وقت میگریم کہ کس بیدار نیست

سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اس کے دیوان کو نمکدان شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے۔

تصوف اور درویشی:۔ عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرانے میں ادا کرنا۔شاہد مطلق کے شیون وصفات کو زلف وخال وخط ولب ودہن وغیرہ سے تعبیر کرنا کاملین عرفا اور مشائخ پر رند وبادہ خوار، میفروش وغیرہ کے الفاظ کا اطلاق کرنا اور ان کے حالات وواردات کو شراب ونغمہ ودف وچنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا۔سلوک وفقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر ورضا وتسلیم وتوکل وقناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔محتسب اور زاہد وفقیہہ محل ادب ہیں طعن وتعریض کرنا اور غیر متشرع اور آزاد لوگ جو از روے مذہب قابل توہین ومذمت ہیں ان کی خوبی ظاہر کرنا۔دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا۔ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی وبدنامی کی رغبت ظاہر کرنا عقل ودانش کی جابجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اس کی

تعریف کرنا ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور ان سے شراب و نغمہ کا اس لئے طلبگار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ باد صبا کو اپنا پیغامبر ٹھیرانا اور نسیم سحر و بوئے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور ان کو اپنا قاصد و پیغامبر ٹھیرا کر ان سے اپنی آرزویں، مرادیں اور حسرتیں بیان کرنا۔

ای صبح نسیم گر باز اتفاقی افتدت
آفریں گوئی برآں حضرت کہ مارا بار نیست

اور کبھی سعدی کہتے ہیں کہ اگر میرا دل تیرے عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے تو عیب مت سمجھو کیونکہ چاند بے نقصان اور زربی عیب و گل بی خار نہیں رہتا۔

گر دلم در عشق تو دیوانہ شد عیبش مکن
بدر بی نقصان وزربی عیب وگل بی خار نیست

سعدی بہار کے موسم سے متعلق کہتے ہیں۔ کہ یہ توبہ شکن ہے ملاحظہ کیجے

درخت غنچہ بر آورد وبلبلان مستند
جہاں جواں شد و یاران بعیش بنشستند
کساں کے در رمضان چنگ ونی شکستندی
نسیم گل بشنیدند و توبہ بشکستند
بساط سبزہ لکد کوب شدبہ پای نشاط
زبس کہ عارف و عامی بہ رقص برجستند

اور کبھی کہتے ہیں کہ عشق میں بلاوں سے پرہیز نہیں کر سکتے جو عاشق ہوتے ہیں وہ گرفتار جور ہوتے ہیں اس سے نہیں ڈرتے

نہ شرط عشق بود کز بلا بپرہیزند
گرفتگان ارادت بجور نگریزند

اور بھی کہتے ہیں

اگر ہلاکت سعدی بہ تیغ فرقت تست
حلال باشد خونی کہ دوستاں ریزند

کبھی کہتے ہیں تیرے پیچھے پڑے رہنے میں ہمارا قصور نہیں ہے اپنے غمزہ سے کہو کہ آدمیوں کے دل کو نہ بھولیں۔

دنبال تو بودن گنہ از جانب مانیست
باغمزہ بگو تادل مردم نہ ستاند

کبھی محبوب کے ہجر کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی دوری میری ہڈیوں میں نیش زنی کر رہی ہے۔

من ماندہ ام مہجور از اوبیچارہ در بخور ازاو
گوی کہ نیشی دوراز او بر استخوانم میرود

اپنے محبوب کی تعریف ایک غزل میں مسلسل اس طرح کی ہے اس کے ابرو کو محرابوں سے اس کے دہن کو انگبین سے تشبیہ دی ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ میں اس کو سرو کہنا چاہتا تھا لیکن سرو میں رفتار نہیں ہے اور ماہ سے تشبیہ دینا چاہتا تھا ماہ بات نہیں کرتا۔

سرو را مانی و لیکن سرو را رفتار نیست
ماہ رامانی ولیکن ماہ را گفتا نیست

کبھی محبوب کی معرفت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ سالہا میں اس کی تلاش میں رہا حالانکہ وہ خود میرے گھر میں ہے۔

سالہا درپی مقصود بجان گردیدیم
دوست در خانہ وما گرد جہاں گردیدیم

سعدی عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار اور عمیق کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلبستگی کے زمانے میں ہر انسان پر گذرتے ہیں۔ جن کو ہر شخص بیان نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گذری ہے مثلاً وصل کی امید میں ہجر بسر کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا تصور کیا جاتا ہے۔

اے کہ گفتی ہیچ مشکل جز فراق یار نیست
گر امید وصل باشد ہمچنیں دشوار نیست

کبھی کہتے ہیں کہ عشاق کی میں نے عیب جوئی کی تھی اور اس کے نتیجہ میں خود بھی عاشق ہوا لیکن اس جرم کے لیے یہ سزا بہت ہے۔

بی دلان را عیب کردم لا جرم بیدل شدم
آن گنہ را ایں عقوبت ہمچناں دشوار نیست

بعض وقت سعدی تصور اور عرفان کے باریک نکتوں کو بھی بیان کرتے ہیں کہتے ہیں ہر چیز کی ایک وقت رنگ اور شان ہے تو ترک صفت کر دے تاکہ تجھ میں من وتو کا فرق باقی نہ رہے۔

ہر کس صفتی دارد ورنگی ونشانی
تو ترک صفت کن کہ ازیں بہ صفتی نیست

کبھی کہتے ہیں کہ سنگ وگیاہ کہ اپنے اندر خاصیت رکھتے ہیں وہ اس آدمی سے بہتر ہے جو کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

سنگی وگیا ہی کہ در آن خاصیتی ھست
از آدمیٔ بہ کہ در او منفعتی نیست

اور کبھی راضی بہ رضا رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

آن دوست نباشد کہ شکایت کند از دوست
بر خون کہ دلارام بریزد دیتی نیست

اور پھر کہتے ہیں۔

صبر تلخ ست ولیکن چکنم گر نکنم
چون گریز از لب شیرین شکر بار تو نیست

سعدی کے کلام میں آزادی کی تعلیم ملتی ہے وہ بادشاہ وقت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

خزاین پر از بہر لشکر بود
نہ از بہر آئین و زیور بود
چو دشمن خر روستائی برد
ملک باج دہ یک چرامی خورد

یعنی خزانے لشکر کے لئے ہیں شان وشوکت اور آرائش کے لئے نہیں۔ جب چور دہقانوں کا جانور چرا لے جاتا ہے تو بادشاہ خراج کیوں لیتا ہے۔

آرام طلب بادشاہوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تو کے شنوی نالہ داد خواہ
بہ کیوان برت کلہ خواب گاہ

تم مظلوموں کی فریاد کیا سنو گے، تمہاری خوابگاہ کی چھت آسمانوں سے ٹکراتی ہے۔

اور کبھی بے غرضی اور آزادی کے اثر میں اکثر کہتے ہیں۔

دلیر آمدی سعدیا در سخن
چو تیغ بدست است فتحی بکن
بگو انچہ دانی کہ گفتند بہ
نہ رشوت ستانی و نہ عشوہ دہ

ای سعدی تو بولنے میں دلیر ہے جب تیرے پاس تیغ زبان ہے تو ملک فتح کر جو کچھ جانتا ہے کہ تو نہ رشوت خوار ہے نہ سخن ساز۔

غرض شیخ سعدی کے کلام میں تم کو زندگی کی تمام اقدار و مسائل کے متعلق اشعار ملتے ہیں جو سعدی کی شعری عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔

کس خوبصورتی سے سعدی شب ہجراں میں موت کی آرزو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مجھے شب ہجراں میں موت آجائے تو روز قیامت میں دوست کے پہلو میں خیمہ لگادوں گا۔

گر شب ہجراں مرا تاختن آرد اجل
روز قیامت زنم خیمہ بہ پہلوی دوست

اور کبھی کہتے ہیں کہ میری ہر غزل ایک نامہ ہے نامہ لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ دوست تک نہیں پہنچتا اگر میری غزل اس تک پہنچ جائے تو اظہار حال ہو جائے گا۔

هر غزلم نامه ایست صورت حالی در آن
نامه نوشتن چه سود چون نرود بسوی دوست

کبھی کہتے ہیں۔ درویش یعنی مرد خدا مشرق و مغرب میں غریب نہیں ہے جہاں کہیں بھی وہ جاتا ہے۔ تمام دنیا اس کا وطن ہے۔

آنرا که جای نیست همه شهر جای اوست
درویش هر کجا که شب آید سرای اوست

یا

مرد خدا به مشرق و مغرب غریب نیست
هر جا که می رود همه ملک خدای اوست

ایسے بے خانماں کو جس کا خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا اس کو گدا مت کہو کیونکہ سلطان بھی اس کے گدا ہوتے ہیں۔

بی خانماں که هیچ ندارد بجز خدا
اورا گدا مگوی که سلطان گدای اوست

اگر دولت مند لوگ اپنے دوست پر دولت نچھاور کرتے ہیں تو میں اپنی جان اس کے پیامبر کے قدموں پر نچھاور کرتا ہوں۔

گر زر فدای دوست کنند اهل روزگار
ماسر فدای پای رسالت رسان دوست

کبھی کہتے ہیں کہ غیروں کا میری خلوت میں کوئی بار نہیں ہے جو میرا دوست نہیں ہے وہ میرے لئے بار ہے۔

درون خلوت ما غیر در نمی گنجد
برو که هرچه نه یار منست بار منست

کبھی محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے گرچہ تو غنی ہے اور میں فقیر ہوں لیکن دوستوں کی دلداری ثواب ہے۔

گرچہ تو غنی وما فقیریم
دلداری دوستان ثواب است

کبھی کہتے ہیں اگر رقیب بھی ظلم کرتا ہے تو صبر کرتا ہوں کیوں کہ گل کے ساتھ ہمیشہ خار ہوتے ہیں۔

صبر بر جور رقبت چہ کنم گر نکنم
ہمہ دانند کہ در صحبت بگل خاری است

محبوب ہر روز کل ملنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن سعدی کی شب کے لئے کبھی وہ کل نہیں آتی

ہمہ شب می پزد سودا ببوی وعدہ فردا
شب سودائی سعدی رامگر فردا نمی باشد

کبھی کہتے ہیں کہ سعدی کا دل سوز عشق سے ایک آتش کدہ کی مانند ہو گیا ہے جو اس کے اشعار سے ظاہر ہے۔

آتش کدہ است باطن سعدی زسوز عشق
سوزی کہ در دلست در اشعار بنگرید

سعدی اپنے محبوب کے چہرہ کو پراز در عقیق کہتا ہے اور اس کی زلفوں کو مار سے تشبیہ دی ہے جو خزانہ کی حفاظت کے لئے ہے۔

گنجیست پرز در عقیقین آں پسر
بالائی گنج حلقہ از مار بنگرید

غزل مولانا روم

خدا نے انسان کو جب ہستی کا جامہ پہنایا تو اس میں کچھ گل بوٹے بھی بنا دیئے جس کی بدولت گلشن حیات کی رنگینی جنت نظر بن گئی۔ حسن ازل کی طرف سے جو کچھ انسان کو ملا اس میں ایک دل بھی ہے۔ جس کے ساتھ عشق بھی پیدا کیا گیا اور دل "مقام عشق" ٹھہرا۔ عشق کو نطق عطا کرنا مقصود ہوا تو دل کو زبان عشق یعنی ملکہ شعر نصیب ہوا۔ عالم شعر کے لئے ساری رونق جذبات کی بدولت ہے۔ عشق اس کی جان اور روح رواں ہے۔ جس قدر قوی اور لطیف یہ جذبہ ہوتا ہے اور کوئی جذبہ نہیں۔

عشق می گویم وجان می دہم از لذت وئے

جس طرح عشق کے مظاہر مختلف ہیں اسی طرح مراتب اور مدارج بھی مختلف ہیں۔ جیسے مظاہر حسن غیر محدود ہیں ویسے ہی عشق کے مراتب اور مدارج بھی مختلف ہیں۔ قلب انسانی کبھی حسن فطرت کا شیدا ہوتا ہے اور کبھی درد ملت سے بے تاب کوئی کسی سیمیں تن نازنین کے ایک ہی جلوہ سے اس قدر سحر زدہ ہوتا ہے کہ بس سب کچھ اس کی ایک نگاہ لطف پر نچھاور کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن یہ حسن و عشق کی فانی صورتیں ہیں۔ عشق کا محرک حسن ہے حسن جس مرتبہ کا ہوگا کشش عشق بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ عشق حقیقی میں ناز اور نیاز دونوں بے نظیر ہیں۔ عشق حقیقی میں دبدبہ، جلال اور جذبہ، استقلال و بے خودی اور بے نفسی اور تسلیم و رضا پائی جاتی ہے جو عشق مجازی میں ہیں۔ اور اسی مسلک کا نام تصوف ہے۔

غزل کی بلندی اور ترقی کی تاریخ تصوف کی ترقی سے وابستہ ہے۔ محبوب اور مطلوب کی بلندی کے باعث عشق و محبت کو بھی بلندی حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب صفا کے کلام میں جس قدر بلندی فکر، جذبات، پاکیزگی خیال صداقت احساس اور اثر اخلاص پایا جاتا ہے وہ کسی اور گروہ کے کلام میں نہیں۔

صوفیانہ شاعری ان الفاظ اور خیالات سے پاک ہوتی ہے جو پاکیزگی اور تہذیب کے خلاف ہوتے ہیں ۔ مثلاً بوس و کنار وغیرہ اگرچہ عشق حقیقی کے صدہا مضامین مجاز کے پیرایہ میں ادا کئے جاتے ہیں لیکن صرف اس حدتک کہ بادہ و ساغر کے استعارہ میں مشاہدہ حق کی گفتگو ہوسکے ۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

عشقیہ شاعری کا کمال عشقِ حقیقی پر موقوف ہے اور یہ تصوف کے ساتھ مخصوص ہے ایران میں مولانا روم کا زمانہ صوفیانہ شاعری کے عروج کا زمانہ ہے ۔ عشقیہ شاعری کے حسن و کمال میں دنیا کی کوئی زبان فارسی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ جو معنوی حسن و بلندی تصوف کی وجہ سے اس کو حاصل ہے ۔ شاید ہی دنیا کی کسی اور قوم یا زبان کی شاعری میں ہو اس پر جس قدر فارسی دان ناز کرے بجا ہے ۔

تذکرہ نویس متفق ہیں کہ ابتدا میں جن لوگوں نے صنف غزل کو ترقی دی اور اس کے مردہ جسم کو معنی اور اثر کی روح بخشی اور غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں اگرچہ کلام کے صوری محاسن اور لطائف کے اعتبار سے مولانا کی غزلیات سعدی اور عراقی کے ہم پایہ ہیں لیکن مختلف معنوی خصوصیات کے باعث ان کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے ۔ جو ان کو فارسی کے دیگر غزل گو صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے ۔

مولانا کی غزلیات مختلف وجوہ کے باعث مولانا کی تصانیف کا تفصیلی و تمثیلی مطالعہ کرنے والے پر حسب ذیل خصوصیات کو منکشف کرتا ہے ۔

یہ فارسی کے سب سے بڑے معنوی غزل گو شاعر تھے ۔ غزلیات مولانا کے معنوی اور ادبی ارتقا کا پہلا زینہ ہے ۔ فارسی غزل میں مولانا کی غزلیات پیغام گوئی کا بہترین نمونہ ہے ۔ گرمی عشق بے تابی الفت، اسرار خودی اور رموز بقا کی جس قوت سے پردہ کشائی کی گئی ہے ۔ اس کی مثال فارسی شاعری میں سوائے اقبال کے کسی اور کے پاس نہیں ملتی ۔ اور اقبال بھی

بادہ رومی سے سرشار ہیں۔ان کی غزل مسلسل نظم معلوم ہوتی ہے جس میں عشق و محبت اور دیگر احساسات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو دل کے حال کو آنکھوں کے آگے نمایاں کر دیتا ہے۔

غزل کی خوش قسمتی ہے کہ شیخ سعدی نے یہ نغمہ کچھ ایسی دلآویزی سے چھیڑا کہ ہر زندہ دل اس سے مسحور ہو گیا۔ خسرو اور حسن دہلوی نے تو اسے بولتا جادو بنا دیا۔ جس نے فارسی غزل کو غزل بنایا اس میں مولانا روم کا خاص حصہ ہے۔اور وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ اگر ان کے کلام کے صرف شعری حصہ پر نظر کی جائے تو ان کی جگہ صف اول کے غزل گو شعرا میں ہو گی۔

مولانا کا کلام سخن عشق ہے اس لیے وہ دلی جذبات کا آئینہ ہے ۔ان کا کلام اور زندگی ہم آہنگ ہیں ۔سوز دل کے متعلق فرماتے ہیں۔

عشق شد مہمان ہر دل سوختہ
جان و دل زر بہر او قربان کنم

اضطراب عشق اور انتظار کے جذبات کی کس قدر کامیاب ترجمانی ہے۔

قراری ندارد دل و جان ما
کناری ندارد بیابان ما

دل عاشق ہر وقت حضور کا متمنی ہے۔

یک لحظہ ز کوئی دوست دوری
در مذہب عاشقاں حرام است

عاشق بے تاب کوئی یار میں چکر لگاتا ہے اور اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ کسی دن خود محبوب اس کی گلی میں آجائے ۔اور اس کوچہ ویران کو اپنے قدم سے جنت بنا دے۔

مخمور و مست گردان امروز چشم مارا
رشک بہشت گردان امروز کوئی مارا

اور غالب نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے۔

معنی وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون تھا
خانہ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

باوجود اس کے عاشق بے خودی تمنایوں ہے۔

یکدست جام بادہ ویکدست زلف یار
رقص چنیں میانہ میدانم آرزوست

مولانا کے کلام کی دوسری خصوصیت حقائق کا بیان ہے۔ انہوں نے بے شمار انفس و آفاقی حقایق کی ترجمانی فرمائی ہے۔ حقیقت بین نظر کے لیے اس میں رمز شناسی اور راز دانی کا ایک غیر محدود ذخیرہ ہے۔ اور یہی مولانا کی معنوی خصوصیت اور حقیقی قدر و قیمت ہے۔

عشق و بندگی کے متعلق کہتے ہیں۔

دیگران آزاد سازند بندہ را
عشق بندہ میکند آزاد زا

ان کا کلام حقائق کا ایک دریائے بے پایاں ہے۔ مولانا کے کلام میں جوش خیال اور بیان کی فراوانی ہے اور اسکی نظیر کسی اور غزل گو صوفی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ تخیل کی برق رفتاری پائی جاتی ہے۔ قلب میں عشق کی گرمی اور جذبات کا طوفان برپا ہے۔

مولانا کے خاص مضامین مثلاً عشق کی اہمیت اس کے ساتھ انسان کی عظمت اور عروج انسانی کی راہ عقل و عشق کا مقابلہ دل کی تربیت اور اس کے طریقہ وغیرہ ہیں۔

مولانا نے عشق اور اس کے متعلقات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اس کثرت سے اشعار لکھے ہیں کہ اگر ان کے دیوان کو "ترانہ عشق" کہیں تو بے جانہ ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ عشق زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ عشق ہی سے قربانی پیدا ہوتی ہے۔ عارف رومی اپنے عشق کو ابدیت بخشنا چاہتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کا محبوب ابدی ہو۔

عشق زندہ در روان و در بصیر
ہر دلی باشد زغنچہ تازہ تر

عشق آن زندہ گزین کو باقیست
از شراب جانفزایت ساقیت

عشق اور مذہب میں ربط کا بہی محل ہے۔ جب تک مذہب صحیح معنوں میں ہوتا ہے یہ اتحاد قائم رہتا ہے۔ جب ذوق فنا ہوجاتا ہے تو ان دونوں میں افتراق پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا نے عشق پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے پاس عشق سے مراد "عشق خدا" ہے۔

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است
گر شکر خوردن بود جان کندن است
عشق جز دولت و ہدایت نیست
جز کشاد دل و عنایت نیست

وہ کہتے ہیں کہ "مومن از عشقست و عشق از مومن است" حقیقت شناسی کے لیے ایک عقل کا راستہ ہے، دوسرا ایمان کا۔

عشق کے جذبات کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

دل پیش رخش چہ رقص می کرد
و از آتش عشق جان چہ می شد

عشق میں غم سہتے سہتے عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو اس میں لطف آنے لگتا ہے اس حال میں اس کی نظر درد و غم پر پڑتی ہے۔ صرف لطف محبت کا ہی خیال رہتا ہے۔ وہ غم کو مسرت سمجھتا ہے۔ اور آسانی سے برداشت کرلیتا ہے۔

مسئلہ توحید یعنی ایک کے ہو رہنے پر مولانا نے بیحد زور دیا ہے۔ اور اس میں جوش اور غیرت دلانے کا انکا خاص انداز نمایاں ہے۔

مولانا صرف ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے زبان مانوس اور کان آشنا ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات میں سادگی ہے اور خیالات الجھے ہوئے ہیں۔

مکانم لا مکاں باشد نشانم بے نشان باشد
نہ تن باشد نہ جاں باشد کہ من از جاں جانانم

مولانا روم کی مثنوی پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اس لیے میں نے یہاں ان کی غزل کی چند خصوصیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خسرو حسن بحثیت شاعر

خسرو اور حسن سپہر علم کے دو درخشندہ ستارے ہمعصر شاعر تھے۔ نہ صرف یہ شعر و سخن میں باکمال تھے بلکہ ان کی روحانیات بھی مثل آفتاب اجاگر تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں آفتاب عالمتاب نظام الدین اولیاء مرکز روحانیات کی طرف کھینچ کر رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں ستارے اسی آفتاب کے عکس ہیں اور اسی کا فیض تھا جس نے ان دونوں کو اس طرف متوجہ کیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ضیاء الدین برنی کی ضیاء پاشیاں اس چیز کو روشن کرتی ہیں کہ یہ دونوں آسمان کے ستارے حضرت نظام الدین اولیاء کی تجلی کدہ پر بغلگیر ہوئے اور یہیں سے انکی دوستی کی ابتداء ہوی۔ شبلی نے بھی شعرالعجم میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ فرشتہ نے بھی انکی دوستی کے واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن مصنف تاریخ جلالی نے اس کو ایک افسانوی رنگ دیا ہے جس کا حوالہ ہمیں شعرالعجم (جلد دوم شبلی نعمانی) میں ملتا ہے۔

خسرو اور حسن کی دوستی بھی مشہور زمانہ ہے اور ان کے ممدوحین بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ کیوں کہ دونوں ایک ہی دربار سے منسلک رہے ہیں۔

سعدیؒ سے پہلے متقدین غزلیں کہتے ہی نہیں تھے یا اگر کہتے بھی تھے تو ان کی غزلیں روکھی پھیکی اور سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن سعدیؒ نے اس رنگ کو بدلا ایک حد تک جذبات، واردات اور معاملات بیان کر کے غزل کے افسردہ قالب میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس کا رتبہ کئی درجہ بلند کر دیا۔ میر حسن اور سعدیؒ کے زمانے میں یہی رنگ زیادہ کامل اور مقبول سمجھا جاتا تھا۔ اور غزل میں ہر شخص اسی کی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ حسن اور خسرو نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔ دونوں کا خیال ملاحظہ ہو۔

خسروا سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود
گر بنوشی درد از میخانہ درد اے حسن
درد معنی از مئے سعدی شیرازی دہی



حسن نے تو سعدی کے تتبع کو کمال تک پہنچادیا تھا لوگ ان کو "سعدی ہند" کہنے لگے تھے۔ان کے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی یوں رقم طراز ہیں۔

دویم شاعری از شعرائے یگانہ در عصر علائی امیر حسن سجزی بودہ است واورا تالیفات نظم و نثر بسیار و سلامتی ترکیب و روانی سخن آیت بودہ است و ازبسکہ غزلہائے وجدانی در غایت روانی بسیار گفتہ است اورا "سعدی ہندوستان" خطاب شدہ بود۔غزلیات جگر سوز اوراز چقماق دلہائے عاشقاں آتش محبت بیروں میں آرد و اشعار دل پذیر او راحتے بدلہائے سخنوراں می سازند و لطائف روح افزائے اورا مایہ اہل ذوق است ، و سخن این بزرگ چاشنی شیخ سعدی دارد۔" (مقدمہ دیوان حسن سنجری)

حسن کے پاس غزلیں ہیں لیکن ان میں صرف چند ہی غزلیں پائے کی سمجھی جاتی ہیں۔ مولانا شبلی نے ان کی غزلوں کے متعلق یوں اظہار رائے فرمایا ہے۔

صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہے جو سوز و گداز جذبہ اثر ان کے کلام میں موجود ہے وہ ان کے کشتہ محبت امیر خسرو میں بھی نہیں ۔(شعرالعجم جلد دوم) سوز و گداز ملاحظہ ہو۔

خسرو کہتے ہیں کہ موسم گل آگیا ہے اور تمام بلبل باغ کی طرف جارہے ہیں لیکن جو مرغ ترے ہجر میں گرفتار ہے اسکو آشیاں کی ہوس نہیں ہے

گل آمد و بباغ رسیدند بلبلاں
و آں مرغ رفتہ را ہوس آشیاں نبود

کبھی کہتے ہیں کہ خسرو اگر میرا گل یعنی میرا محبوب گلزار سے چلا جائے تو مت رو کیونکہ ہر چمن کے لیے خزاں ضروری ہے۔

خسرو اگر گل تو ز گلزار شد منال
دانی کہ ہیچگاہ گل بے خزاں نبود

اس شعر میں بے ثباتی دنیا کی طرف بھی اشارہ ہے۔حسن کا خیال ملاحظہ ہو۔کہتے ہیں کہ

اس سال رونق گل کچھ اچھی نہیں ہے کیوں کہ باغ میں میرا سرو خراماں ہی نہیں ہے۔

اما رونق گل تر آنچناں نبود
بے سرو گل بدیہہ و بلبل رواں نہ بود
ایں کارواں گل پس سالے رسید لیک
ماہے کہ در دست دریں کارواں نہ بود

علامہ شبلی غزل خسرو کے بیان میں یوں رقمطراز ہیں۔

"اس وسیع مرقعہ میں صرف امیر موصوف (خسرو) کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے۔" غزل کے میدان میں بعض مقامات پر حسن خسرو سے دو قدم آگے ہیں لیکن قصائد اور مثنوی اور دوسرے اصناف سخن میں وہ امیر خسرو کو نہیں پہنچ سکتے جس کا اقرار خود انہوں نے کیا ہے۔

خسروا از رہ کرم مپذیر
آنچہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چوں سخن خسرو نیست
سخن ایں است کہ من می گویم

خسرو نے حسن کی خوبیوں کا اس طرح اعتراف کیا ہے

خسروا عشق تو اسرار حدیث است مگر
کز سخن ہائے توام بوے حسن می آید

جامی نے بہارستان میں حسن کے کلام پر یوں اظہار رائے کیا ہے:۔

خواجہ حسن را در غزل طرز خاص است اکثر قافیہ ہائے تنگ و ردیف ہائے غریب می نمودند لاجرم از اجتماع آنہا شعر وے اگرچہ در بادی الرائے آسان می نماید اما در گفتن دشوار است بناء بر این اشعار وے را سہل ممتنع گفتہ اند

صاحب تاریخ فیروز شاہی یوں رقم طراز ہیں:۔

"من در لطافت و سلاست عقل و تہذیب اخلاق مثل خواجہ حسن ندیدہ ام"

باوجود ان تمام خوبیوں کے حسن کم گو شاعر ہیں جس کا انہیں خود اعتراف ہے۔

رسم حسن ہمیشہ چو کم گفتن آمدہ است
زین بیشتر مجال نداد این قصیدہ را

۶۳ سال کی عمر تک انہوں نے جو کچھ لکھا اور قابل اشاعت سمجھا وہ دس ہزار ابیات ہیں جو اودھ کے شاہی کتب خانہ کے نسخہ میں غزلوں کے ۵۳۳ اور قصائد کے ۴۹ اور رباعیات کے ۲۰۰۷ جملہ ۱۰۲۷ ابیات بتائے گئے ہیں۔ شکیل احمد صاحب جو حسن پر ریسرچ کر رہے ہیں لکھتے ہیں کہ حسن کے ایک اور دیوان کا ذکر ملا ہے لیکن وہ دیوان ابھی تک لاپتہ ہے اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اس کے برخلاف خسرو نہایت پرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ خسرو نے بہارستان جامی کے مطابق چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم اشعار کہے۔ فردوسی باوجود قادر الکلام شاعر ہونے کے ستر ہزار سے زیادہ اشعار نہ لکھ سکا۔ فردوسی صرف مثنوی کا استاد ہے۔ سعدیؒ غزل کے بادشاہ ہیں کمال اسمٰعیل۔ خاقانی اور انوری ظہیر اور عرفی قصیدے لکھتے ہیں لیکن خسرو ہی وہ تنہا شاعر ہے جس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اس کی قادر الکلامی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے عزۃ الکمال اور مطلع الانوار صرف پندرہ پندرہ دن میں لکھیں۔

حسن کے کلام میں خسرو کی طرح روانی تو ہے لیکن غنایت نہیں ملاحظہ ہو۔ خسرو

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چوں میکنم دل بچنین روز زدلدار جدا

حسن:۔

ساقیا مے دہ کہ می خاست از خاور سفید
سرو را سر سبز شد صد برگ را چادر سفید

حسن اور خسرو دونوں کی مشترک خصوصیت ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے

ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے حسن کی تو زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں ہی ہیں۔ چھوٹی بحر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا لہجہ نرم ہے اور جذبہ میں گداز ہے۔ خسرو کے کلام میں سوز بہت ہے۔

خسرو کہتے ہیں کہ اے نادان طبیب میرے سرہانے سے ہٹ جا کیوں کہ میں درد ہجر میں مبتلا ہوں اور میرا علاج سوائے دیدار دوست کے نہیں ہے۔

از سر بالیں من برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

حسن اسی مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں کے طبیب کو میرے درد ہجر کا علم نہیں ہے وہ جو دوا بتلائے گا وہ میرے لئے سود مند نہیں ہو سکتی۔

طبیب علم ندارد زدرد فرقت عشق
چہ سود مند بود شربتے کہ او فرمود

خسرو نے مختلف صنف سخن میں الگ الگ شعراء کا تتبع کیا ہے۔ غزل میں سعدی۔ مثنوی میں نظامی مواعظ و حکم سنائی خاقانی۔ قصائد میں رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمعیل۔ حسن نے بھی غزل میں سعدی کا پورا پورا تتبع کیا ہے اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خسرو کا رنگ جداگانہ ہے۔ قصائد میں خاقانی کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں خسرو کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن حسن ان کی پیروی نہ کرسکے۔ مثنوی بھی لکھی ہے لیکن نظامی کا تتبع نہ کرسکے۔ لیکن خسرو کے خمسہ کے جواب میں اوروں کے مقابلہ میں بہت حد تک پورے اترتے ہیں۔

خسرو اور حسن دونوں کے پاس رعایت لفظی بہت ہے جو سبک ہندی کا طرز ہے۔ اس کو مراعات النظیر بھی کہا جاتا ہے۔

شاخ و برگ و محبت و محنت
ہر دو از یک نہال می گیرند

یہاں پر حسن نے شاخ و برگ کی رعایت سے نہال استعمال کیا ہے۔ ایسی کئی مثالیں

مل سکتی ہیں۔

حسن اور خسرو دونوں کے پاس وصف نگاری اور مضمون آفرینی موجود ہے۔ حسن کی وصف نگاری ملاحظہ ہو۔

جاں کز زلف مشکیں دام کردند
جہاں زیر ہرمو رام کردند

اور ایک جگہ زلف کا وصف بیان کیا ہے۔

بندے اگر کشاید از زلف ظالم او
از ہر خمی برآید فریاد داد خواہی

میں نے کہا ہے کہ اگر اس کے ظالم زلفوں کے بند اگر کھولے جائیں تو ہر ایک خم سے داد خواہوں کی فریاد نکلے گی یعنی میرے محبوب کی زلفوں کا یہ حال ہے کہ اس کے بند میں چاہنے والوں کے دل اسیر ہیں جب یہ بند کھولے جائیں گے تو یہ سب فریاد شروع کر دیں گے۔

خسرو نے بھی اپنے محبوب کی زلف کا وصف اسی طرح بیان کیا ہے۔

جان زبند کالبد آزاد گشت
دل بگیسوئے تو زندانی ہنوز

کہتے ہیں کہ جسم کی قید سے روح تو آزاد ہو گئی۔ لیکن دل ابھی تیرے زلفوں کی قید میں اسیر ہے۔ حسن اپنے محبوب کا وصف یوں بیان کرتے ہیں۔

سمن ساقی وسوسن بوے دلالہ روی ونسرین بر
تعالی اللہ اگر انصافست گلزار این چنیں باید

کہتے ہیں کہ میرا محبوب سمن کی طرح ہے اور اس کے جسم سے سوسن کی بو آتی ہے اس کا چہرہ لالہ کی طرح روشن ہے اور اس کی آغوش نسرین کی طرح صبیح ہے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو خود میرا محبوب ایک گلزار ہے مجھے باغ میں جانے کی بھی حاجت نہیں۔

خسرو اپنے محبوب کا وصف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پری پیکر نگارے ، سروقدے ، لالہ رخسارے
سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

اس شعر میں حسن سے زیادہ خسرو کے پاس برجستگی ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ میرا محبوب پری پیکر ہے۔ اس کا قد مانند سرو ہے اور رخسار مانند لالہ اسی لئے میں گلستان سمجھ کر اس کے سائے میں شب بسر کر رہا تھا اور میرے دل کے لئے ایک آفت بنا ہوا تھا۔

تشبیہ شاعری کے چہرے کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت بنادی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بے کار تھیں۔ امیر خسرو اور حسن نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں۔

قدما پہلے محبوب کی چال کو کبک سے تشبیہہ دیتے تھے خسرو نے کبوتر سے سب میں پہلے تشبیہہ دی۔

زہی خرامش آں حازنیں بہ عیاری
کبوتری بہ نشاط آمدست پنداری

حسن اور خسرو نے شطرنج کی بہت سی اصطلاحوں کو استعمال کیا ہے۔ خسرو

شطرنج عشق باز کہ ما بہر پرتو
خود را بماتگاہ رسانیم وشد کنم
تخت شاہیست کہ برفیل نہد فرزیں بند
رخ درین عرصہ منہ بیدق ایں شاہ نہ

حسن

نزد عشقت پاک می بازم ولے ترسم ازانک
کعبتیں چشم غلطانی مرا بازی دہی
چشم شوخ توکہ درعین دغا اندازی
مہرہ برچیدہ ازیں سوختہ اندازی

غزل کی ترقی کا نوروز لطف ادا، اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں

لیکن پھر بھی وہ نقش اولین تھا۔ خسرو اور حسن کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سینکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیئے جو اگلوں کے خواب وخیال میں نہ آئے تھے۔ ایک غزل بھی امیر خسرو کی ایسی نہیں ملتی جس میں کوئی نئی تشبیہہ نہ ہو۔

حسن کے پاس بھی اکثر نئی تشبیہیں ملتی ہیں لیکن حسن ہر غزل کے کسی نہ کسی مصرعہ میں کوئی بات ایسی کہہ دیتے ہیں جو ایک چبھتا ہوا اثر رکھتی ہے۔

غلام نرگس مستم کہ با مداد وپگاہ
قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہہ دیتے ہیں اور تشبیہہ عام تھی لیکن اس اسلوب بیان میں نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے ایک خاص لطف پیدا کر دیتا ہے کیونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اسی لئے خواب دیکھنے کی توجیہہ وقفیت رکھتی ہے۔ خسرو کہتے ہیں۔

میروی وگریہ باز آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

یہ بھی انوکھا خیال ہے کہ جب تو جانے لگتا ہے تو مجھے جدائی کے غم سے رونا آتا ہے تو کچھ دیر بیٹھ جاتا کہ بارش تھم جائے یعنی تو جانے کا خیال ہی مت کر کیوں کہ تو جب بھی جانے لگے گا مجھے رونا آجائے گا۔

معشوق کی گراں قدری کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے

ہر دو عالم قیمت خود گفتہٴ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حسن کا خیال ملاحظہ ہو

ماعشق ترا بجاں خریدیم
اینست زعمر حاصل ما

چشم محبوب کو سب مخمور اور مئے آلود باندھتے ہیں۔ خسرو کہتے ہیں مجھے شراب کی

ضرورت ہی نہیں جس وقت تیری آنکھوں میں خمار رہے میں تیری مخمور آنکھوں سے ہی مستی پالیتا ہوں۔

مئے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باشد

حسن نے محبوب کی آنکھوں کا وصف یوں بیان کیا ہے۔

چشم او در جادوئی شاگرد کیست
کانچہ او کرد اوستادی ہم نکرد

نہیں معلوم آپ کی آنکھیں جادوگری میں کس کی شاگرد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جتنا اچھا جادو کر سکتی ہیں ان کا استاد بھی نہ کرے گا۔ چشم محبوب گویا ایک ساحر ہے۔

لطف و قہر کی نگاہ کا فرق ملاحظہ ہو

کہتے ہیں کہ کس طرح مارتے ہیں اور جلاتے ہیں تو وہ ان کی نگاہ کا کرشمہ ہے کہ ایک نظر سے تو مارتے ہیں اور دوسری ہی نگاہ میں زندہ کر دیتے ہیں یعنی نگاہ لطف زندہ کرتی ہے اور نگاہ قہر مار ڈالتی ہے۔

حسن اپنے محبوب کے خال و چشم کے بارے میں لکھتے ہیں

پیوستہ بہ دنبالہ چشمت رود آں خال
ہندو بچہ ترک کماندار ببازی

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو یوں ادا کیا ہے۔

بت بوقت تقویٰ وآخر ایں نمی دانی
کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

پھر کہتے ہیں کہ تاریک شب تھی اور میرا جینا تلخ ہو گیا تھا کہ ناگاہ ایک شمع شکر بار کی آمد ہوئی جس سے زندگی مل گئی۔

تاریک شبی داشتم وتلخ حیاتی
ناگاہ یکی شمع شکر بار در آمد

اسی خیال کو جگر نے یوں پیش کیا ہے

خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

خسرو نے معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کیا ہے

جان زنظارہ خراب وناز او اندازہ بیش
ما بہ بوی مست وساقی پردہد پیمانہ را

حسن نے کس لطف سے اسی خیال کو پیش کیا ہے

اے حسن دست تو در فتراک دلش کے رسد
ایں طرف فقر قوی آں سو غنای باکمال

یعنی اے حسن تیرا ہاتھ وصل کی فتراک میں کس طرح پہنچے گا تو تو فقر کی عادت رکھتا ہے لیکن تیرا محبوب غنی ہے۔ اکثر جگہ صرف ایک دو لفظوں کے الٹ پھیر سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں۔ خسرو۔

چشم بد دور از چناں روی
کہ از وچشم دور نتواں کرد

یعنی ایسے چہرے سے چشم بد دور رہے جس پر سے نظر ہٹتی ہی نہیں یعنی خوبصورت محبوب کو نظر نہ لگے۔ حسن

اورا کہ از سودات زیاں دیدم گفت
کار سودات گہی سود بود گاہ زیاں

اس شعر میں سودا کے ایک جگہ معنی خیال کے ہیں اور دوسری جگہ کاروبار عشق میں جو حالات پیش آتے ہیں ان کے بیان کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔ اہل لکھنو نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے۔ بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں۔ خسرو کی معاملہ بندی ملاحظہ ہو۔

شبہا بروز آمد بسی کنزدل نہادی یاد را
جانم زتن آمد بروں بوی نہ دادی باد را

دی سوی سرو لالہ رخ پیغام دادم باد را
بنوشتہ خط بندگی آں سوسن آزاد را

عموماً شعراء اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے۔ خصوصاً غزل کی زبان روز مرہ اور عام بول چال کی ہونی چاہیے کیوں کہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا ہے اور حسن کے پاس بھی یہ پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا رمز یہی ہے۔

خسرو محبوب سے کہتے ہیں تم نے بہت سے دل لیے ہیں خوب غور کر کے دیکھو جو بہت زخمی ہے وہی میرا دل ہے۔

دل بسی بردہ نکو بشناس
آں کہ مجروح تر از آن من است

حسن کہتے ہیں کعبہ جا کر دعا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے میرا تو کعبہ بھی تو ہی ہے اور مقصود بھی تو ہی ہے۔

گفتی کہ بہ کعبہ رو دعا کن
خود کعبہ ماتوئی دعایم

خسرو اور حسن نے روز مرہ اور محاورہ کو بھی استعمال کیا ہے۔

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم
کہ از ابروے تو چشم بدو محراب افتاد

میرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ کا دھوکا پڑتا ہے کیوں کہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر

آتی ہیں۔

امیر خسرو نے ایسے بھی کئی محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور قادر الکلام شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً "از گرہ اوچہ میرود" "آواز کردن" گفتار میگو یم، مالا کلام کردن کسی کو ساکت و بند کرنا وغیرہ۔

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویوں، قصے یا اخلاق کے لیے مخصوص نہیں۔ قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ جذبات نگاری کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا کم رواج ہے۔ امیر خسرو اور حسن نے البتہ مسلسل غزلیں لکھی ہیں خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بہار میں کیا کیا لوازمات ہو اس کی تفصیل اس غزل میں ملتی ہے۔

ہنگام گل است بادہ باید
ساقی وحریف سادہ باید

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ حسن نے بھی بعض نئے مضامین باندھے ہیں اور ان دونوں کے کلام میں قدما کے مقابلہ میں ایک انوکھا پن اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

زہی عمر دراز عاشقان گر
شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی عاشقوں کی عمر میں شامل کر دیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے۔

خسرو کے صنائع بہت بے تکلف ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں۔ صنعت طباق میں اضداد ان کی خاص چیز ہے۔

درد ہا داری و درمانی ہنوز

حسن اور خسرو دونوں کے پاس تصوف ہے لیکن عشق حقیقی کو بصورت مجاز بیان کیا گیا ہے۔

گر ای زاہد دعائی خیرمی گوی مرا این گو
کہ این آوارہ کوی بتاں آوارہ ترا بادا

دنیا کی بے ثباتی کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے۔

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
یا رب چہ روز بود کہ ازما جدا شدند
گونو بہار آمد وپرسد ز دوستاں
گو ای صبا کہ آن ہمہ گل ہاگیہا شدند

کہتے ہیں کہ جو میرے دوست تھے وہ سب نہ جانے کہاں چھپ گئے معلوم نہیں کس منحوس دن وہ مجھ سے جدا ہوئے تھے کہ آج تک مل نہ سکے۔ نو بہار آکر دوستوں سے پوچھتی ہے تو کہہ کہ وہ تمام گل زمین میں پنہاں ہو گئے ہیں ان کی خاک پر سبزہ اگ رہا ہے۔ غالب نے اس خیال کو یوں بیان کیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس غزل میں خسرو نے مسلسل بے ثباتی دنیا کا ذکر کیا ہے۔

حسن کے پاس بھی تصوف بلا کا ہے اور وہی حقیقت و مجاز کا امتزاج ہے۔

از خلد و بہشت بے نیازم
تا کوئی تو گشت منزل ما
گر زفراقت حسن گم شدہ حیرتست
ما کہ ترایافتم یافتم حیراں تریم

حسن اور خسرو کی شاعری کی عظمت کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شعراء نے تتبع کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز جیسے بزرگ نے حسن کی غزلوں کا تتبع کیا ہے۔ جس کا خود انہوں نے اپنے دیوان "شمس عشاق" میں ذکر کیا ہے۔

تغزل حسن سجزی۔۔ ایک مطالعہ

غزل کی قدما کے زمانے تک کوئی خاص شکل نہ تھی۔ پہلے قصیدے اور رباعی کا رواج تھا۔ بعد میں قصیدے کی جو تشبیب ہوتی تھی اسی نے غزل کی شکل اختیار کی۔ سب سے پہلے نظامی گنجوی نے باقاعدہ غزل کے سانچے کو استعمال کیا پھر سعدی نے غزل کو صحیح معنوں میں ایک علاحدہ صنف سخن کے مرتبہ پر پہنچایا۔ امیر خسرو اور حسن کی غزل گویا خم خانہ، سعدی و حافظ کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچ کر اور تیز ہو گئی ہے۔

صاحب شعرالعجم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حسن کا صنف غزل پر خاص احسان ہے۔ ان کے اشعار سے بہ آسانی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں ہے وہ کشتۂ محبت امیر خسرو کے پاس بھی نہیں امیر خسرو نے خود اس کا اعتراف کیا ہے:

خسروا شعر تو اسرار حدیث است مگر
کز سخنہائے توام بوئے حسن می آید

مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"چوں کہ ان کی نظمیں اور غزلیں وجدانی اور رواں ہوتی ہیں اس لیے وہ سعدی ہندوستان کہلاتے ہیں اور ان کے دل پذیر اشعار سے سخنوروں کے دل راحت پاتے ہیں۔ ان کے کلام میں سعدی کے کلام کی چاشنی ہے"۔

خود اپنی نظم کے بارے میں حسن کی رائے ملاحظہ ہو:

بر نظم حسن دیدم شہرے شدہ دیوانہ
زیرا کہ نمی یابند این طرز بہ دیوانہا

حسن اپنی غزل کی برتری سے خوب واقف ہیں:

شعر حسن ، شعر متیں ، خاصہ غزل سحر مبیں

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو حسن کے اشعار میں بلا کی متانت ہے اور کہیں بھی ان کے اشعار

ثقافت کی حد سے نہیں گرنے پاتے۔ان کی شاعری بعض جگہ ساحری نظر آتی ہے۔

غزل کی خصوصیات میں سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز شامل ہیں اور اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ یہ معاملات جس زبان میں ادا کیے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔یعنی زبان سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، جملوں میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ ہو۔اگر یہ تمام چیزیں کسی شاعر کی غزل میں جمع ہو جائیں تو وہ غزل کا بہترین شاعر سمجھا جائے گا۔حسن کے پاس یہ تمام چیزیں موجود ہیں بلکہ سوز و گداز کو انتہا تک پہنچا دیا ہے:

طبیب علم ندارد ز درد ضربت عشق
چہ سود مند بود شربتی کہ او فرمود

یعنی علم کو عشق کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جبکہ اس نے عشق کی چوٹ نہیں کھائی وہ اگر میرے درد عشق کی دوا کرنا چاہے تو مجھے کیا فائدہ ہوگا۔

ہجر کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔تیرے غم ہی سے میرے دل بے قرار کو قرار حاصل ہوتا ہے:

مسکین حسن ز وصل تو ماند است بد نصیب
با غم قرار دادہ دل بے قرار را

کبھی کہتے ہیں کہ تیرے فراق میں جان دے دینا آسان نہیں ہے لیکن اس سے بھی مشکل تیرے ہجر میں زندگی بسر کرنا ہے:

جاں دادن از فراق تو آسان نبود لیک
این زیستن بہجر تو دشوار شد مرا

کبھی کہتے ہیں کہ میرا دل آتش کدہ ہے اور تو میرا خلیل ہے۔تیرے ہجر کی وجہ سے میرا دل آتش کدہ بن گیا ہے۔ایک دم کے لیے میرے پاس آجا اور اس آگ کو گلستان بنا دے۔

دارم دلے آتش کدہ آخر خلیل من توی
برمن فرود آ یک دمی آتش گلستان کن مرا

کبھی کہتے ہیں کہ میرا دل مانند شمع ہے اور ہر روز گزشتہ دن سے زیادہ جلتا ہے۔ شاعر اپنا حال محبوب کو لکھنا چاہتا ہے لیکن حال غم دروں ملاحظہ ہو:

کاغذ ز گریہ ترشد و خامہ ز آہ سوخت
شرح فراق خویش بتو چوں توان نوشت

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

حال دل لکھوں کیوں کر جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

کہتے ہیں انسان خاک سے بنا ہے اس لیے اس کو شراب سے سیری ہی نہیں ہوتی جس طرح ریت پر شراب ڈالنے سے جذب ہو جاتی ہے اسی طرح میرا حال ہے:

خاکیاں را نیست از مئے سیریے
گوئی اندر ریگ می ریزند آب

کبھی اپنے گناہوں کا عذر اس طرح کرتے ہیں کہ گناہ جو مجھ سے سرزد ہوتے ہیں وہ میری طرف سے نہیں بلکہ گناہ گار نفس کی طرف سے ہیں:

ہرچہ نقش گناہ می بینی
آں ز نفس گناہ گار منست

کبھی کہتا ہے تیرا چہرہ دیکھ کر تجھ کو سجدہ کرتا ہوں میرے مذہب میں یہی نماز ہے:

رویت نگرم و سجدہ آرم
در مذہب ما ہمیں نماز است

اور آگے کہتے ہیں:

برخاک رہت کنم تیمم
ہرجا کہ قدم نہی سعید است

کہتے ہیں کہ دنیا طلبوں کو محبوب حقیقی کا علم کیا ہو سکتا ہے۔ یہ دولت صرف درویشوں کے حصے میں آئی ہے۔ ان کے دل میں اتنا سوز ہوتا ہے کہ وہ اس ادراک کو حاصل کر سکتے ہیں۔

دنیا طلبان راچہ خبر از غم مولا
این گنج بجز در دل درویش نیابی

عشق میں جو حالات پیش آتے ہیں ان کے بیان کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔اہل لکھنو نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے کہتے ہیں عشق میں آسودگی ہی نہیں ہوتی:

گفتم بر غم عاشقان آسائشی گیرم ز تو
استغفر اللہ زین سخن عشق تو و آسودگی

اپنے شب و روز کو حسن معشوق کے دم سے منور و درخشاں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں وہ کون سی آنکھ ہے جو تیرے چہرے کے فراق میں پرآب نہیں وہ کون سا دل ہے جو تیری جستجو میں نہیں ہے۔میرے روز و شب تیرے دم سے منور ہیں یہ ماہ و مہر کا کام نہیں ہے:

کو دیدہ کز فراق رخ تو پرآب نیست
کو دل کہ در کشاکش عشقت خراب نیست
روزم توبر فروز شبم را تو نور بخش
این کارتست کار مہ و آفتاب نیست

کبھی کہتے ہیں ہماری مستی کا باعث شراب نہیں ہے بلکہ یہ محویت عشق کی مستی ہے، شراب میں محبت کا کیف ہے اس پر کوئی احتساب نہیں ہو سکتا:

اے محتسب تو خیمہ بہ خمار خانہ زن
بگزر ز ماکہ مستی ما از شراب نیست

عشق کے لئے سوز کا ہونا ضروری ہے اور وہی دل پختہ ہوتا ہے جو اس دولت سے بہرہ ور ہو، سوز دروں کے بغیر عشق بے معنی ہے:

دلی نا پختہ بہ عشقش بسوز
خام بود ہرکہ درو سوز نیست
دل کہ درو چاشنی سوز نیست
محرم اسرار دل امروز نیست

کبھی کہتے ہیں کہ میں تیرے عشق کو اپنی جان کی قیمت دے کر خرید تا ہوں اور یہ میری زندگی کا حاصل ہے۔

ما عشق ترا بجاں خریدیم
اینست زعمر حاصل ما

لیکن اردو شاعر فانی نے کہا ہے:

جان سی شئے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو یہ سستی ہے

اس مضمون کو حسن نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

رسم عاشق چیست جان در عشق جاناں باختن
ہم بیک داد نخستین کفر ولمان باختن

حسن عشق کو عشق کے معاملات سے بالکل الگ سمجھتے ہیں:

سر عشقت از دل عشاق پرس
عقل را زحمت مدہ ایں کارہ نیست
خرد معزول وعشق اندر تصرف
عسس بیرون ودزد اندر حصار است

عشق کی تعریف میں کہتے ہیں:

طریق سہل پندار عشق بازی را
حقیقتیست غم عاشقی مجازی نیست
بوالعجب مذہبیست مذہب عشق
ہر کہ توبہ کند گنہ گار است

بعض نہایت لطیف جذبات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے:

اشکم زتیغ غمزہ خوبان روان تراست
صبرم زگنج وصل عزیزان روان تراست

حسن کے لطیف جذبات کی طرح ان کی زبان بھی لطیف، شیریں اور نرم و رواں ہے۔ ان کی غزل کے اکثر شعر تیر و نشتر کا درجہ رکھتے ہیں اور انداز گفتگو دل میں اثر کر جاتا ہے۔ خصوصاً مقطع میں وہ بڑی لطافت و نزاکت سے کام لیتے ہیں:

عالمی را غرق می بینیم بہ دریائے طلب
تو کجا یابی حسن این گوہر نایاب را

عموماً شعرا اور اہل کمال اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ادب عالیہ کی ایک جداگانہ زبان بن جاتی ہے لیکن یہ شاعری کا بڑا نقص ہے۔ بلاشک شاعری میں ایسے خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ضرورت نہ ہو تب بھی شاعر علمی زبان استعمال کرے۔ خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور بول چال کی زبان ہونی چاہیے۔ قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی، خسرو اور حسن نے اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ حسن کی غزل اس نقص سے پاک ہیں۔ ان کے خیالات صاف اور واضح ہیں۔ ترکیبیں بھی سلجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ محاورے کی صحت کا بھی وہ بہت خیال رکھے ہیں۔ رعایت لفظی کے بھی دلدادہ ہیں لیکن کہیں لفظی یا معنوی تعقید پیدا ہونے نہیں دیتے:

چو گل در جلوہ شد بلبل ہمیں گفت
کہ اکنون بے گلستان چون توان بود

اس شعر میں گل کی رعایت سے بلبل اور گلستاں کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

چشم نرگس، غنچہ لب، چوں سبزہ زارے کرد گل
پردہ از رخ برفگن مارا تماشائے بہ بخش

مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ:

"خواجہ حسن نے غزل میں ایک خاص طرز اپنایا تھا، تنگ قافیوں اور غیر معمولی ردیفوں میں شعر کہتے تھے ان کا کلام اگرچہ بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر ایسا کلام کہنا سخت دشوار ہے۔ اسی وجہ سے اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں۔"

ہلالی نے حسن کے اشعار کی نزاکت کا اعتراف کیا ہے:

ہلالی از کمال شعر دارد منصب شاہی
کہ سوز خسروست وتازگی ہائے حسن با او

حسن نے اس خصوصیت کے لئے سعدی کا اتباع کیا ہے:

حسن گلے زگلستان سعدی آورد است
کہ اہل معنی گلچین آن گلستان است

*****

درخم معنی حسن راشیرہ نو ریخت عشق
شیرہ از خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

حسن کی نمایاں خصوصیت لہجاز کا اہتمام اور اشارے ہیں۔ کبھی شعر میں ایسا لفظ لے آتے ہیں جو پورے جملے کا بدل ہو جاتا ہے:

بسیار خطا کردی ، باز آئی حسن اکنوں
روئے بزمیں آور ، درویشی درویشاں
(بطفیل درویشی درویشاں)

باحسن گفتی چرا عاشق شدی
صد جوابست ایں سوالت را
(ولے از راہ ادب جواب گفتن نمی توانم).

اکثر غزلوں میں "صرف قوافی پر اکتفا کرتے ہیں اور ردیف کا سہارا نہیں لیتے اور اس کے باوجود غزل کے حسن میں کمی نہیں آئی۔ اکثر مشکل قافیے اختیار کرتے ہیں۔ اور متداول بحر، ردیف اور قافیوں سے بچتے ہیں۔ ان کے دیوان میں متقدمین یا معاصرین کی زمینوں میں بہت کم غزلیں ملیں گی۔ بعض غزلوں میں ایک خاص لفظ کا التزام کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

ماہ سبک سیر امرا اشتر بکار آید ہمی

انہوں نے متروک الفاظ اور ترکیبیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ استعمال کی ہیں:

نزد تو آورد حسن قصہ عجز وبیکسی
تو بکمال مرحمت ، بیکس وعاجزش مماں

اماں بمعنی، مگزار، اسی طرح یکسوں بجائے یکسو، ہزہمہ، بجائے ہمہ، وفرمودگی، بجائے شنیدہ ۔ انہوں نے "نرد" اور شطرنج کی اصطلاحیں بھی بکثرت استعمال کی ہیں جیسے:

چشم شوخ تو کہ درعین دغا اندازی
مہرہ برچیدہ ازین سوختہ پا اندازی

*****

نزد عشقت پاک می بازم ولے ترسم ازانکہ
کعبتین چشم غلطانی مرا بازی دہی

باوجود صوفی ہونے کے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ کم ہے اور عاشقانہ رنگ غالب ہے جو اس زمانے کی خصوصیت ہے ۔ اس زمانے میں صوفیائے کرام جو ہمہ اوست کے قائل تھے وہ اس مسئلہ کے علانیہ اظہار سے اجتناب کرتے تھے ۔ حسن کے کلام میں جو صوفیانہ رنگ ہے ملاحظہ ہو:

تمام عمر مرا صرف شدہ بہ غواصی
درے ہی طلبم کان بہیچ دریا نیست

*****

گرشوق سر زلفش از اہل وفا جوئی
اندر تہہ خرقہ زنار برون آید

کبھی کہتے ہیں میں نے بادشاہ عشق کو دیکھا، دعا کی ۔ اس وقت پاسبان سورہا تھا اور رحمت کے دروازے کھلے تھے اسی لئے دعا مستجاب دی:

شاہ رادیدم ، دعا کردم ، اجابت یافتم
پاسبان خفتہ ودرہائے رحمت باز بود

*****

مرغان غریبیم اسیر قفس ہجر
ما زار قفس باز بہ بستان کہ رساند

کہتے ہیں کہ حسن ازل سے ہی مست الست ہے۔ میں اپنے محبوب کا پرانا دوست ہوں اس لئے اس کی صحبت کو اچھی طرح پہچانتا ہوں:

از ازل جان حسن مست الست آمد بلی
یار دیرینہ شناسد صحبت دیرینہ را

کہتے ہیں کہ اگر حسن تیرے غم کی قدر کو نہیں پہچانتا تو اس کو معاف کر دے۔ تیرا عفو کامل ہے تیرے سامنے ایک مشت خاک کا گناہ کیا چیز ہے:

گر حسن قدر غمت نشناخت اورا عفو کن
پیش عفو کامل تو جرم مشت خاک چیست

کبھی کہتے ہیں حسنِ نے تجھے پالیا۔ اس کی ساری مرادیں مل گئیں:

ہر کہ بتو رسید رسیدش ہمہ مراد
کشت رسیدہ رانم باراں چہ حاجتست

*****

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا

گناہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم گناہ نہیں کرنا چاہتے لیکن ہماری فطرت ہی بد ہے وہ بہانہ تلاش کرتی ہے۔

ما گناہی نہ کردہ ایم ولی
خوئی بدرا بہانہ بسیار است

*****

گفتی حسن چرا نہ کنی توبہ از شراب
واللہ کہ توبہ کردم و مستی نمی رود

کہتے ہیں تیرا دیوانہ ایک میں ہی نہیں بلکہ تمام عارف وعامی تیرے دیوانے ہیں:

در خانقہے کافتد ذکر لب شیرینش
از حجرہ ہر صوفی خمار برون آید

حافظ نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے:

بساط سبزہ لگد کوکب شد بپائی نشاط
زبسکہ عارف و عامی برقص برجستند

میں ہر روز جو اختر شماری کرتا ہوں وہ اس لیے ہے کہ شاید کبھی میرا محبوب بھی مثل ماہ آشکا ہو جائے۔

مگر طالع شود یک شب چو ماہے
حسن ہر شب ستارہ می شمارد

دنیا کہتی ہے کہ صبر کرو لیکن میرے دل میں صبر کی جگہ ہی نہیں میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔

خلق گویند دل از صبر بجا آور باز
اے دل از صبر نشانی دہ اگر جائے ہست

کبھی کہتے ہیں کہ محبوب نے وعدہ کیا تو ہے لیکن اس کا اعتبار نہیں اور نہ ہی صبر ہو سکتا ہے اور نہ تقاضا ہی ممکن ہے۔

طرفہ سروکاری است کہ باوعدہ معشوق
صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

کبھی کہتے ہیں:

دامن چوگل ، سرشک چولالہ ، مژہ چوابر
مارا ہوائے عشق کم از نوبہار نیست

سب لوگ خوشی کے خزانے سے اپنا اپنا حصہ لے گئے لیکن میرا حصہ ابھی تک معین نہیں:

زگنج شادی ہر قوم قسمتی بردند
منم کہ قسمت من تاکنون معین نیست

جدید اسلوب ملاحظہ کیجیے

می شکنم بار غم عشق تو بردل کوہ کوہ
خرمن صبر بیاد نیستی شد گاہ گاہ

یعنی تیرے غم کا بار میرے دل پر اتنا ہے کہ وہ غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ دا' کبھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

شاعر اکثر اپنے محبوب کو ماہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے دانتوں حسن نے انہیں تشبیہوں کو نہایت لطافت بخش دی ہے:

در در صدف آن آب نداردکہ تو داری
مہ برفلک آن تاب نداردکہ توداری

میرے ہجر کی تاریک راتوں کو تیرے رخ سے جو روشنی ساطع ہوتی ہے وہ منور کرتی ہے اور میری روح کے چراغ کا تیل تیرا وصال ہے:

شب فراق مرا جز رخ تو روشن نیست
چراغ جان مرا جز وصال روغن نیست

جگر نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے:

خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

اور فانی کہتے ہیں

گھر میں رہتا ہے ترے دم سے اجالا ہی کچھ اور
مہ و خورشید کی تنویر بدل جاتی ہے

زندگی کی بے ثباتی کو حسن نے اس طرح بیان کیا ہے:

عمر ما یار چند روزہ ماست
عشق تو آشنائی دیرینہ

حسن کی جاذبیت اور جمال کے مختلف انداز پر استعجاب کا اظہار کرتے ہیں:

یوسفی یا ماہ گردوں یا فرشتہ یا صنم
دائما عشق را اندر گماں افگندہ

******

خورشید وہلال را قرآں کن
مے را وپیالہ را قریں کن

دل میں آگ لگی ہے اور وہ زلفوں میں اسیر ہے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ رات میں جگنو اڑ رہا ہے:

دل آتش گرفتہ ، در زلف
گوہر شب چراغ می بینم

جب تک مجھے تیرا وصال حاصل نہیں ہوا تھا مجھ پر ایک حیرانی طاری ہوئی تھی۔ لیکن جب تیرا وصل حاصل ہو گیا تو یہ حیرانی اور بڑھ گئی یعنی مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق باقی نہ رہا:

گر ز فرقت حسن گم شدہ حیرتست
ما کہ ترا یافتیم ، یافتہ حیراں تریم

غالب نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے:

اصل شہود وشاہد ومشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

محبوب کے لب کا وصف بیان کرنا تھا اسی لئے طوطی کو شکر خوار بنایا:

مگر وصف لب او خواست گفتن
کہ طوطی را شکر خوار آفریدند

حسن بھی حافظ کی طرح نقد کوش ہیں کہتے ہیں:
تیری صحبت ہی میرے لیے بہشت ہے مجھے آگے ملنے والی بہشت کا خیال نہیں۔

بہ نقد امروز با او در بہشتم
مرا بانسیہ ، فردا چہ کا راست

از خلد وحشت بے نیازم
تا کوئے تو گشت منزل ما

اسی مضمون کو آتش نے دہرایا ہے۔

ہے میسر یہ کہ دیکھیں وہ میسر ہو نہ ہو
کوئے جاناں اور ہے گلزار رضواں اور ہے

کبھی خیال آتا ہے کہ جوانی میں تو سوائے گناہ کے کچھ نہ کیا اور بڑھاپے میں جب سفید آجائے تو پھر بال کالے نہیں ہوں گے:

جز سیہ کاری نکردی تا سیاہت بود موئی
چوں سفیدت شد کنوں بعد از سیاہی رنگ نیست

میر نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ان کے محبوب کا چہرہ خود ان کے لیے نو بہار ہے اسی عالم میں خزاں بھی آجائے تو کوئی بات نہیں

ہمہ عالم اگر خزاں گیرد
روئے تو نو بہار است مرا

کبھی کہتے ہیں:

گر اسیرم کنی وگر بخشی
اختیار تو اختیار من است

غرض کہ حسن کے کلام میں ایک نیا پن اور شگفتگی ہے جو ان کے پیش رو شعرا سے انہیں ممتاز بناتی ہے۔ حسن کی اکثر غزلیں مسلسل ہیں اور ایک ہی مضمون کو ان میں پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ حسن کا کلام سوز دروں سے مملو ہے اس لیے پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حافظ و شعرِ حافظ

حافظ اپنے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی حیات سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے مظاہر کی جستجو کرتا ہے۔ برگ گل خوشرنگ اور موسم بہار کی عطر بیز ہوائیں درختوں پر نکلے ہوئے نئے سبز پتے صوت ہزار اور رقص و سرور، لالہ کے ارغوانی جام، نرگس کی چشم نگراں اور سوسن کی زبان، حافظ انہیں فطرت کے دلکش مناظر کو زندگی کے اس انبساط اور لطف کا پیغامبر اور شریک بناتا ہے۔ حافظ اپنے شبستان کیف و سرود میں جو شمع جلاتا ہے وہ ہماری روح میں یک بیک جگمگا اٹھتی ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں کی نزاکت و نکہت اور نسیم بہار کی جان پروری و آب رکنا آباد کی خنک ہوا کی تسکین سے حافظ ہمارے اندر ہماری روح کو معطر و شاداب کر دیتا ہے۔ محبت کے زمرہ میں شیخ حافظ کی نظر بہت وسیع ہے وہ معاشرہ کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اور کہہ اٹھتا ہے۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شری بینم
ابلہان راہمہ شربت زگلاب وقند است
قوت داناھم از خون جگری بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زرین درھمہ گردن خر می بینم
دختراں راہمہ جنگ است وجدال بامادر
پسراں راھمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ بردار یہ بردار دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسری بینم

بنام خدا

شکرشکن شوند همه طوطیان هند

زین قند پارسی که به بنگاله میرود



لسان الغیب حافظ شیرازی

پند حافظ بشنو خواجه برو و نیکی کن
زانکہ پند بہ از در و گہر و می بینم

مشہور ہے کہ ایک دن حافظ "بابا کوہی" کے مزار پر گئے اور بہت آہ وزاری کی رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ انکو لقمہ کھلاتے ہیں اس دن سے کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔

حافظ نے غزل کے علاوہ قصیدہ و مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی انوری نے غزل کی بنیاد ڈالی خسرو و حسن نے اس کو ترقی دی اور حافظ نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

صائب حافظ کے تتبع کا اس طرح اقرار کرتے ہیں۔

رواست صائب اگر نیست از رہ دعوی
تتبع بولی غزل گرچہ بے ادبیست

سلیم نے لکھا ہے۔

سلیم معتقد غزل خواجہ حافظ باش
کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی جیسے خوددار شاعر نے بھی حافظ کے کلام کا اعتراف کیا ہے۔

برآں تتبع حافظ رواست چوں عرفی
کہ دل بہ کارد و درد سخنوری داند

سب سے بڑی چیز جو حافظ کے کلام میں ہے وہ حسن بیان، خوبی ادا، شائستگی اور لطافت ہے۔ حافظ اپنے خیال کو لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ جادو بن جاتا ہے یہ بات حافظ کے علاوہ فارسی ادب میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے خاص مضامین جو شعر میں بیان ہوتے ہیں وہ قناعت، گوشہ نشینی، دنیا سے اجتناب واعظوں کی پردہ داری، رندی اور مستی ہیں۔ یہ مضامین صدیوں سے پامال ہوتے آئے ہیں لیکن آج تک حافظ کا جواب نہ ہو سکا۔

غزل کی ایک خاص زبان ہوتی ہے جس میں نزاکت، لطافت، اور لوچ ہوتا ہے اس قسم کی زبان کے لئے خیالات بھی خاص ہوتے ہیں، علمی یا فلسفیانہ مضامین اگر ادا کئے جائیں تو

وہ رنگینی اور لطافت قائم نہیں رہ سکتی۔حافظ کا یہ خاص اعجاز ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہیں لیکن غزل کی لطافت میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات ان کی غزل میں داخل ہو کر رنگین و لطیف بن جاتے ہیں۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقی نامہ ایست معرفت کردگار

فارسی شاعری میں جوش بیان نظامی اور فردوسی کے پاس ملتا ہے لیکن خاص موقعوں پر حافظ کے یہاں ان کے جذبات ان کے حالات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں اور سننے والے پوری قوت سے متاثر ہوتے ہیں۔دنیا کی بے ثباتی سے متعلق لکھتے ہیں۔

اعتماد نیست بردور جہاں
بلکہ برگردوں گردان نیست ہم

کبھی کہتے ہیں۔

کشتی نشستگانیم اے باد شرط برخیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشارا

اور کبھی اپنی منزل سے ناوقفیت کا اظہار یوں کیا ہے۔

ما نادانیم کہ منزل گہ مقصود کجا است
این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اور کبھی اپنے دل کو غم دنیا و غم معشوق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں بادہ اگر خام ہو تو وہ ہمارے دل کے شیشہ کو پختہ کرتا ہے۔

درد دل ما غم دنیا غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ را

واردات عشق تمام شعراء کے پاس پائے جاتے ہیں۔لیکن قنوطیت کے ساتھ حافظ اس کو ایک فن شریف سمجھتا ہے۔اور بھی عشق مجازی کو بھی اپنے دوست کی تنہائی پر رحم کھانے کی درخواست کرتا ہے۔

پروانہ و شمع و بلبل ھمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

کبھی کہتا ہے۔

بساط سبزہ لکد کوب شد بہ پائی نشاط
زبس کہ عارف و عامی برقص برجستند

محبوب کو کبھی ترک شیرازی کہتے ہوئے اس پر سمرقند و بخارا نچھاور کر دیتا ہے۔ اور کبھی اس کے محراب آبرو کو نماز میں خلل ڈالنے والا سمجھتا ہے۔

می ترسم از خرابی ما کہ می برد
محراب آبروئے تو حضور نماز من

کبھی کہتے ہیں کہ زاہد کی ریاکاری سے کہیں اس کی جنت ہاتھ سے نہ چلی جائے

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز بازخواست
نان حلال شیخ زآب حرام ما

حافظ کے کلام کی جان فلسفہ ہے وہ زندگی کی تلخیوں کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے گوارا بنانا چاہتے ہیں کائنات کی ہزار گرہیں کھلنے کے بعد زندگی ایک راز سربستہ نظر آتی ہے صدیوں کی تلاش فکر بھی صحیح معنوں میں اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہر دانائے راز کی زندگی میں کچھ ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب وہ محسوس کرتا ہے کہ

کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

اور حافظ بھی ایک عالم جسم و روح اور اس کی گونا گوئی کے حیرت و استعجاب میں فکر کی نارسائی اور انسانی علم کی ہنوز تشنگی کا بھی کچھ حقیقت افروز اظہار کر بیٹھتا ہے اور

"حدیث از مطرب و مئے گو و راز دہر کمتر جو"

کہتا ہوا عشرت امروز کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ حافظ کیٹس کی طرح Beauty in Joy اور Joy is Beauty کے ایک گہرے اور وسیع فلسفہ مسرت کی تکمیل کو ایک امید فردا و آج کے تصور سے دعوت لطف و نظر دیتا ہے۔ حافظ کے اشعار ہماری رگوں میں خون کی رفتار

کو تیز کر دیتے ہیں ۔ ڈوبتی نبضوں کو سہارا دیتے ہیں ۔ رکی ہوئی سانسوں کو تازگی بخشتے ہیں اور یاسکو امید میں بدل دیتے ہیں ۔

گل مراد تو آنگہ نقاب بکشاید
کہ خدمتش چو نسیم سحر توانی کرد

کہہ کر حافظ زندگی کی کڑی منزلوں میں سارے وسوسہ حیات کے لئے ایک بڑا سہارا بن جاتا ہے اور

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

کہہ کر نہ صرف انسان کی برتری بلکہ اس کو اپنے فرض کا بھی احساس دلاتا ہے ۔ حافظ کے کلام میں کسی موقعہ پر بھی تھکاوٹ و درماندگی کا احساس نہیں ہوتا اس میں بلا کی اپج ہے ۔ اور

اگر زمانہ بہ تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز

کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے ۔ حافظ عیش پرستی نہیں عیش کوشی کی دعوت دیتا ہے ۔ اور فرصت حیات کو غنیمت سمجھنے اور زندگی کو ہنسی خوشی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ حافظ زندگی کی کثافتوں کو لطافتوں سے بدلنے کا ارادہ رکھتا ہے ۔

حافظ کے مزاج میں ہزاروں سال کا ایک تہذیبی میراث کے زیر اثر ایک خاص نرمی ، شرافت ٹھہراو ، نیکی اور واقعی ایک عظیم شخصیت کی بردباری تھی ۔ اور یہی اس کی شاعری کا مزاج ہے ۔ وہ جہاں دیدہ تھا اور اس کے ذہن کے دروازہ ہمیشہ کھلے رہے اس نے بھی تنگ نظری کا اظہار نہیں کیا اور اسی لئے وہ کہتا ہے ۔

آسائیش دو گیتی تفسیر آں دو حرف است
با دوستان تلطف بہ دشمناں مدارا

وہ خود خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے وسیع مسلک پر گامزن ہے ۔ اور اس نے کبھی ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی بلکہ اس کو انسانوں کی ذہنی و جسمانی آسودگی سے ہمیشہ گہرا ربط رہا ہے ۔ حافظ جانتا ہے کہ زندگی کا راستہ پرخار ہے ۔ اس میں سینکڑوں غم واندوہ شامل ہیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ انسان آلام روزگار کی پروا نہیں کرے بلکہ آج جو میسر ہے اس کو

خوشی سے گزارنا چاہیے۔ اور کہتا ہے۔

اے دل از عشرت امروز بہ فردا افگنی
مایہ نقد بقا راکہ ضماں خواہد شد

اور کبھی کہتا ہے۔

غنیمت داں دمی خود در گلستان
کہ گل در ہفتہ دیگر نباشد

حافظ کے کلام میں عام طور پر تلخی اور غم نہیں پایا جاتا لیکن اپنے طبقے کی خراب حالت اور امیروں اور اہل اختیار کے ہاتھوں ان کی بے عزتی اور ناقدری سے وہ تلملاجاتا ہے اور کہتا ہے۔

فلک بہ مردم ناداں دہد زمام مراد
تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہست بس

اور کبھی کہتا ہے محتسب در خفاے رندان است
تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہ ہست بس کہیں کہیں حافظ کے کلام میں شدید قسم کی تقدیر پرستی پائی جاتی ہے اور انسان کو قطعی مجبور اور بے بس بتایا گیا ہے۔

بر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روز ازل
توچہ دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

حافظ کے کلام میں عشق و محبت کی سرخوشی اور ہمہ گیر جذبے کی لطافت سے پیدا ہونے والے احساسات کا کیف و سرور ہے۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ المناکی اور دل کو پگھلا دینے والی بے چینی ہے جو شعر حافظ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف اسباب بنیاد پر محبت اور دوستی یعنی نشاط حیات کے بنیادی محرکات کی راہیں مسدود نظر آتی ہیں اور وہ اپنے غم میں عندلیب کو شریک کر لیتا ہے۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری
کہ ما دو عاشق زاریم وکار ما زاریست

اس کے نزدیک عشق و محبت اور صدق و صفا لازم و ملزوم ہیں بغیر سچائی کے زندگی میں

خیر و برکت ممکن نہیں۔ اور اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

بصدق کوش کہ خورشید زاہد از نفست
کہ از دروغ سیہ روئی گشت صبح نخست

اور کبھی کہتے ہیں

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

حافظ انسانوں کو دوستی و آشتی کی تعلیم دیتا ہے۔

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل بہار آرد
نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

حافظ کا تعلق بھی اس زمانہ کے دوسرے علماء و فضلا کی طرح شاہی دربار سے تھا۔ حافظ نے اپنی زندگی میں یہی عظیم شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ بنگال اور دکن سے لیکر سمرقند و بغداد و شام تک جہاں فارسی کا رواج تھا ان کا طوطی بولتا تھا۔

غرض کہ حافظ کو جہاں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف سے ان پر پیہم حملے اور اعتراضات ہوتے۔ بعض علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ایک روایت کے مطابق ان کی نماز جنازہ میں شرکت اور ان کے دفن کو ممنوں قرار دیا گیا تاریخ ادبیات ایران میں میر امن نے رسالہ "لطیفیہ عینیہ" کے حوالے سے لکھا ہے۔

فارسی غزل میں عرفی کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت

جس طرح ہر شخص صاحب ثروت نہیں ہوتا اسی طرح ہر شاعر و ادیب صاحب طرز نہیں کہلایا جاسکتا۔ یہ دولت ہر کسی کو نہیں ملتی۔ ایک سیدھا سادا انداز بیان، بانکپن، نفاست، اور موزونیت کا احساس تو ہم کو اکثر کے پاس مل سکتا ہے، لیکن ایک طرز خاص ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ دراصل ایک انوکھے پن، ندرت اور انفرادیت سے وجود میں آتا ہے۔ طرز میں انفرادیت اور ندرت نتیجہ ہوتی ہے شخصیت کی ندرت کا جس شخصیت میں جتنی توانائی اور آب و تاب ہوگی اتنی ہی اس کے طرز میں رعنائی آئے گی۔ اسی نسبت سے ہم کسی ادب پارے یا ادیب کو شخصیت اور طرز خاص کا آئینہ کہتے ہیں۔

شخصیت کو مرکب اثرات کا مرکب سمجھیئے۔ اس میں موروثی خصوصیات، گھریلو ماحول ابتدائی تربیت، گردوپیش کی زندگی سب کا نقش جلوہ گر ہونا چاہیے۔ چنانچہ عرفی کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو اس کی شخصیت کے اہم اعباد کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ عرفی شیراز کے ایک ممتاز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا باپ زین العابدین، ایران کے اہل عرفہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اس مناسبت سے اس نے عرفی تخلص اختیار کیا۔ چوں کہ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لحاظ سے اس کی تعلیم بھی اعلیٰ معیاری ہوئی۔ صفوی سلطنت کا ستارہ عروج پر تھا۔ ایران میں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ عرفی فطرتاً شاعر تھا اور اس ماحول نے اس کی نشو و نما کی اور وہ ابتدا میں ہی بڑے بڑے شاعروں سے ہمسری کرتا تھا۔ اس کو ابتدا سے ہی اپنے کلام اور جدت طبع کا خوب احساس تھا جس سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ پھر اس کی طبیعت میں ایک غیر معمولی خودداری، بلند ہمتی، سنجیدگی اور پاکیزگی بھی شامل تھی۔ مگر ان سب میں خودداری کا جذبہ غالب تھا۔ اس کی خودداری نے

اس کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے کو کسی دربار سے وابستہ کرے۔ سب سے پہلا مدحیہ قصیدہ حکیم ابوالفتح کی شان میں لکھا مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت لکھا گیا تھا۔ گو عرفی کی خوددارانہ طبیعت مدح گوئی کے لیے بظاہر موزوں نہ تھی لیکن شاید وہ زمانے کے ہاتھوں مجبور تھا۔ قصیدے بہرحال اس کو لکھنے ہی تھے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس میں بھی عرفی نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں وہ اپنے ممدوح کے ساتھ خود اپنی مدح نہ کرتا ہو۔ یہاں تک کہ نعتیہ قصیدے میں بھی اس روش کو برقرار رکھتا ہے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ قصیدہ اس کا موضوع نہیں:

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

اس کی غزل میں جو تاثیر، کیفیت اور جادو ہے اس کا راز یہی ہے کہ اس نے اپنی شاعری کے شیش محل کو اپنے تجربات کے آبنوس سے سجایا ہے۔ ان تجربات کو کبھی براہ راست بیان کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی استعارہ و کنایہ کے فانوس چڑھا دیتا ہے۔ مگر یہ بات قطعی ہے کہ وہ نہ اس دور کے مذاق سخن سے متاثر ہوتا ہے نہ عام جاری رنگ میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ اپنی زندگی کی محرومیوں، کامرانیوں، سرشاریوں، آرزوؤں اور نشاط و جستجو کے اس اظہار سے تسکین حاصل کرنے کے لیے اس نے فطری انداز میں غزل کہنا شروع کیا۔ اور اسی غزل کے سرمایہ کو ہم عرفی کی زندگی کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اس کی شخصیت ابھرتی ہے۔

بہ ہرسو می روم بوئے چراغ کشتہ می آید
مگر وقتے مزار کشتگان عشق بود این جا
ہمیں بس است دلیل بقائے عالم عشق
کہ یک شب غم او در ہزار سال گذشت

عرفی نے مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے غزل کے میدان کو وسیع تر کیا۔ قوت تخیل سے شاعری کی دنیا میں نئی نئی راہیں نکالیں، تصنع کے بجائے سادگی کو اپنا شعار بنایا اور اس کے

ساتھ پرکاری کو شامل کیا:

گزشت و سوختم از انتظار و باز ندید

درین دیار مگر رسم باز دیدن نیست

امرد پرستی کا داغ فارسی شاعری کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔ فارسی غزل کا معشوق صنف نازک کے بجائے شوخ طرح دار بچہ نظر آتا ہے۔ حافظہ کا دلبر بھی ترک شیرازی ہی ہے۔ جس کے ہاتھ ایک تل کے عوض وہ سمرقند و بخارا کو بخش سکتا ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

مگر عرفی کے پورے کلام میں کہیں ایسے نشانات نہیں ملتے جس سے اس کے محبوب کے خد و خال معین کیے جاسکیں یا اس سے اندازہ ہوسکے کہ اس کا محبوب کس صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے عشق کی لاج رکھ لی:

عشق عصیان است گر مستور نیست

غزل کا مضمون ہی حسن و عشق ہے لیکن عرفی نے ہر جگہ اخلاق و شرم و حیا کا پاس کیا ہے۔ اس کے کسی بھی شعر سے رندی اور بوالہوسی نہیں جھلکتی بلکہ وہ عشق کے اعلیٰ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ عشق کے مرتبے کو سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہاں ذرا سی غفلت بھی قابل معافی نہیں:

ہاں راہ عشق است کہ رفتن ندارد باز گشت

جرم را این جاعقوبت ہست استغفار نیست

اس کے باوجود بھی وہ واردات و معاملات عشق کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ اور ان کو شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہے:

ترک دل جوئی کند چوں منفعل کردم بلطف

بہ کرمان شرم روئے ہمساں آید گرود

موبہ موہم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک انا الحق گوئی راگیر برسر دار آورد

خودداری کا دامن عشق کے کوچے میں بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا:

در پذیرم صدغم و نکشایم از و سعی لب
دل بہ ماتم دوست لا تالب بہ شیون دشمن است
وصل لیلیٰ مطلب مجنوں نبود اورا مدام
لذت آوارگیہا دشت پیما کردہ بود

اس کے نزدیک غم کی تشہیر کم ظرفی کی علامت ہے۔ عرفی اس کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا:

فغاں نہ شیوہ اہل دل است ای بلبل
و گرنہ من بہ تو افزوں خروش لی کردم

حافظ بلبل کو دعوت گریہ دیتے ہیں تاکہ دونوں دل جلے مل کر آہ وزاری کریں:

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست
کہ مادو عاشق زاریم کارما زاریست

لیکن عرفی کے پاس عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو زندگی میں سوز و ساز پیدا کرتا ہے اور وصل کی خواہش نہیں رکھتا وہ وصل اور بوالہوسی کو ایک جانتا ہے:

چگونہ سوز غم او وہم بسوز دگر
کہ دل فروغ نہ یابد بہ دل فروز دگر

جب دل و دماغ میں ہردم محبوب کا تصور ہو تو اس کو ہجر نہیں کہتے یہ بجائے خود وصال دوست ہے:

زصد وصال نیاید شب انچہ من بخیال
زشیو ہائے تو باعقل و ہوش می کردم

عرفی کا محبوب ایرانی معشوق سے بالکل الگ صفات کا حامل ہے۔ شوخی، دلربائی، دلکشی،

عصمت و حیا اس کے پاس ہے اور وہ جیتا جاگتا انسانی کردار پیش کرتا ہے۔ وہ نہ چراغ محفل ہے اور نہ کسی کی آغوش کی زینت ہے:

عالمے در جلوہ و عاشق نہ بیند غیر دوست
گرز مجنوں پرسی اندر کارواں محمل یکی است

وہ محبوب کے نام سے خدا کو بھی آشنا کرنا نہیں چاہتا:

غیرتم بین کہ بر آرندہ حاجات ہنوز
از لبم نام تو ہنگام دعا شنیداست

جذبات عشق، سوز و گداز، رنج و الم، حسرت و یاس پر منحصر ہیں۔ جو شاعر جتنا زیادہ اس آگ میں جلتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں سوز و گداز اور اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اردو شاعری میں ہم میر کے کلام میں پاتے ہیں۔

عرفی کا عشق ایک روحانی کیفیت ہے جو فطرت کی طرف سے ہر مذاق سلیم کو عطا کی گئی ہے جس میں ہوس کا شائبہ نہیں:

نازم بہ حسن و عشق کہ از جام اتحاد
مستند درمیانہ حیا کم نمی شود

یہ شعر اس کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے پورے کلام میں کہیں بھی اس کی تردید نہیں ملتی۔ اس کا عشق اصلیت پر مبنی ہے۔ نہ تو عشق کی جولانیوں میں آسمانوں کی خبر ملتی ہے نہ زمین کی پستیوں کی۔ بلکہ عام انسانوں کی طرح اس دنیا میں رہتا ہے۔

غزل میں چوں کہ عشقیہ شاعری ہوتی ہے۔ اس لیے صرف یہ ہجر و وصل، بزم و خلوت تک محدود تھی۔ صرف عاشق کی مرادوں کی معراج تھی۔ فارسی غزل میں عام طور پر اخلاقی مضامین نہیں ملتے اور اگر ملتے ہیں تو وہ بالکل خشک فلسفہ بن جاتے ہیں جس میں شاعری باقی نہیں رہتی۔ عرفی نے اس صنف سخن میں نئے موضوعات و مضامین کو اپنا کر غزل کی دنیا کی وسعتوں کو کہیں زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اور اخلاقی مضامین بھی اس خوبی سے نظم کیے ہیں کہ ان میں بھی عجیب لطف و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

عجز و انکساری، خاکساری، کو وہ قطعاً پسند نہیں کرتا:

کفران نعمت گہ مندان بے ادب
در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر است

کسی کا احسان لینا اس کی سرشت میں ہی نہ تھا۔ اگر خدا بھی بغیر کسی عوض کے بہشت عطا کرتا ہے تو وہ اس عطیے کو بھی ٹھکرا دیتا ہے:

گرفتم آن کہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

جو شخص خدا کی عنایت اور مہربانی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ خضر کے التفات کو کہاں خاطر میں لا سکتا ہے:

خضر اگر برلب کس منت آبے دارد
بگذر از چشمۂ حیوان کہ سرابے دارد

جب قناعت و استغنا داخل سرشت ہو تو حاتم کی داستانیں دل کو نہیں لبھاتیں:

بیا بہ ملک قناعت کہ درد سر نہ کشی
ز قصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طے بستند

دنیا فانی ہے ہمارے جیسے ہزاروں مسافر آئے اس دنیا میں۔ ایک ایک قبر میں ہزاروں لوگ مدفون ہیں تو اس پر ناز کرنا کیا معنی اور ہم یہ کیوں سمجھیں کہ ہمارے بغیر دنیا چل نہیں سکتی۔ ہم نہ ہوں گے مگر دنیا تو چلتی رہے گی۔

اخلاقی مضامین کے ساتھ ساتھ اس نے فلسفے اور شاعری کو بھی ایک جان کر دیا ہے۔ کم و بیش سب ہی شاعر و ادیب اپنی اپنی قوت پرواز کے مطابق ذات باری کے بارے میں خیال آرائیاں کرتے رہے ہیں لیکن عرفی نے اس شعر میں جس طرح اس کا اظہار کیا ہے۔

براگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاران دیگرے رامی پرستند

شاید ہی اس سے بہتر کسی اور شاعر نے کہا ہو اور پھر یہ شعر ملاحظہ ہو:

آنان کہ وصف حسن تو تفسیر می کنند
خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

وہ کفر و اسلام کی تفریق کو برا سمجھتا ہے۔ ذات باری کا جلوہ چاہے کہیں بھی ہو وہ عاشقان صادق کے لیے کشش کا باعث ہے:

عاشق ہم از اسلام جدا است ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر چہ داند

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بت خانہ خوشتر است
ہرجا کہ ہست جلوہ جاناں خوشتر است

مختصر یہ کہ عرفی کی انفرادیت اور جدت کا اس کے سب دوست اور دشمنوں نے اقرار کیا ہے۔ اس کو ایک طرز خاص قرار دیا ہے۔ قصیدہ ہو یا غزل اس کا طرز اس پر ختم ہو گیا۔ اس کی شاعری میں سادگی اور جوش مل کر ایک عجیب امتزاج پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی مضمون آفرینی کے متعلق شبلی فرماتے ہیں:

"عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اقرار کیا ہے اس میں مطلق شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی قوت تخیل نہایت زبردست تھی لیکن اس زمانے کا مذاق، مبالغہ، جدت، تشبیہ اور حسن تعلیل وغیرہ پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت تخیل بڑھی ہوئی تھی اس لیے عرفی نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کیے جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑنا لازمی تھا"۔

عرفی کے طرز کی خوبی اس کی معنی آفرینی اور صرف اعلیٰ تراکیب کی تازگی اور ندرت میں ہی نہیں ہے۔ اگرچہ ان تراکیب میں حسن کاری بھی اور بلاغت بھی ہے عرفی کے یہاں

فلسفہ اور تصوف کے ساتھ اصلیت و واقعیت ہے۔ اس کے پر معنی و پر خلوص گہرے تھر تھراتے ہوئے جذبات و واردات کے لیے اس کا اسلوب موزوں ہے۔ ظاہر ہے کہ جامہ زیبی حسن کو ہی زیب دیتی ہے۔ خالص غزل کے لحاظ سے ہم عرفی کو صرف سعدی اور حافظ کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں۔

بیدل

شعر العجم فی الہند میں شیخ اکرام الحق نے مرزا بیدل کے متعلق یوں لکھا ہے ۔ "مرزا عبد القادر بیدل عہد عالمگیری کے عالی مقام شاعر ہیں ، انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کا عہد اول سے آخر تک دیکھا اور اسکے بعد کا وقت محمد شاہ رنگیلے تک بسر کیا ، جہاں ایک مضبوط حکومت کے زیر سایہ شرعی حد بندیوں کی سختی سامنے آئی وہاں سیاسی بد نظمی کے سبب تعیش اور تن آسانی کی زندگی کی آوارگی بھی پیش نظر رہی ، فکر مندی کا دور تھا بیدل جو ایک طبع آزاد اور فکر رسا رکھتے تھے ان مواقع سے پوری طرح بہرہ مند ہوئے ۔ مگر انکی شاعری اپنے ماحول کے خلاف ایک گونہ بغاوت تھی ۔ اس جذبہ نے انکی طبیعت کی موزونیت کو اور بھی جلا دے دی ۔" (ص ۔ ۱۲۷ طبع لاہور ۱۹۶۱ء)

چہار عنصر میں جو بیدل نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں لکھی ۔ ان شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے جس سے مرزا کی طبیعت متاثر ہوئی اور یہ چھ ہیں ۔ شیخ کمال ، شاہ ملوک ، شاہ یکہ ، شاہ فاضل ، شاہ ابو القاسم ، شاہ کابلی ۔ یہ سب اکابر تصوف سمجھے جاتے تھے ۔ اور بیدل کی شاعری کے محرک تھے (چہار عنصر ۔ مخزونہ سالار جنگ لائبریری)

بیدل کی طبیعت غیر مرئی اشیاء اور اوہام کی طرف راغب ہوئی اور انکی شاعری تصورات کی صورت اختیار کر گئی ۔

انھوں نے امراء و سلاطین کی مدح کو کبھی گوارا نہیں کیا خود لکھتے ہیں ۔

اے کہ تعریف سلاطین کردۂ
مشق تعلیم شیاطین کردۂ

البتہ بہت زیادہ امراء سے انکے تعلقات تھے ۔ عالمگیر باوجود شعر دشمنی کے بیدل کے اشعار سند کے طور پر پیش کرتا تھا ۔

چہار عنصر میں انھوں نے اپنے واقعات اور دوسروں کے کمالات کا بیان کیا ہے انھیں

عملیات سے شغف تھا۔ وہ استغنا صفت، آزاد روش، فقیر منش، فقیر دوست تھے۔ انکی جسمانی صحت انکی فکری تنومندی سے ظاہر تھی۔ میر غلام علی آزاد کے قول کے مطابق بیدل نے ایک لاکھ کے قریب شعر کہے اور سخن کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ مثنوی میں "محیط اعظم" "عرفان" "طلسم حیرت" اور "طور معرفت" قابل ذکر ہیں۔ کلیات، رباعیات، قصائد اور قطعات کا مجموعہ دیوان ہے۔

بیدل نے اپنی فکر کی تکمیل تخیلات اور تصوف سے کی تو اسکی تکمیل وحدت الوجود سے

آں جلوہ بے نشاں کہ نے رنگ نہ پوست
پیدائی و پنہانی او حرف مگوست

کبھی کہتے ہیں کہ عشق کائنات کے ہر عمل میں جاری و ساری ہے۔

فسون و افسانہء تو ومن فشاند بر چشم و گوش دامن
غبار مجنوں بدشت روشن، چراغ موسیٰ بطور پیدا

کبھی وہ کہتے ہیں کہ انسان یہ سب چیزیں دہر و کعبہ کا جھگڑا چھوڑ کر عشق سے لو لگالے

زندگی تاکی ہلاک کعبہ و دیرت کند
بہ کہ از دوش افگنی این جامۂ احرام را

وہ کفر و دین اور شک اور یقین کے جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی اصل وجہ پرخاش ہے۔

کفر و دین شک و یقین سازیست بے آہنگ و ربط
ہوش اگر داری بہ فہم اے بیخبر پرخاش نیست

انھوں نے عشق کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے یوں تو شعرا اپنے دل کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بغیر عشق ندانیم ہیچ آئینہ
گزیدہ ایم چو پروانہ سوختن مذہب

وہ تسبیح اور زنار کی قید سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ متاخرین مغلیہ شعراء میں تصنع اور غرابت نگاری کا جو رواج شروع ہوا تھا بیدل اسے ایک قدم اور آگے لے گئے۔ اسکے ضخیم کلیات پر غنی اور ناصر علی سرہندی کے دواویں کی طرح نگہ انتخاب نہیں ڈالی گئی۔ اور چونکہ وہ علمیت اور فلسفہ میں ان سے بہت آگے تھا اس لیئے بادی النظر میں اس کے کلام میں اشکال اور غرابت ناصر علی سے زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن بیدل کو ان پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔ اسکے دیوان میں جو اشعار ہیں وہ معنی کے لحاظ سے بلند ہیں اور ہندوستانی شاعری پر اسکا احسان ہے۔ اس نے قلوب کو حقائق و معارف کی طرف متوجہ کیا۔ غنی کا طرہ امتیاز تمثیل تھا اور ناصر علی کا مضمون آفرینی تھا۔ بیدل کے طرز سخن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ لیکن اسکی خاص وجہ امتیاز اسکی صوفیانہ شاعری میں تمثیلی رنگ ہے جسکی وجہ سے اہل ترکستان اور افغانستان مثل مولانا روم اسکی بھی تعظیم کرتے ہیں کہ اس نے طبیعتوں کو مجاز اور ظاہری اور عارضی باتوں سے ہٹا کر زندگی کی عمیق حقیقتوں کی طرف پھیرنا چاہا۔ اور اپنے اشعار کو حقایق و معارف کا آئینہ بنایا۔ بیدل میں انتہا کی جدت پسندی تھی نئی نئی بحروں میں غزلیں لکھنا اور زندگی کے حقایق کو الٹ پلٹ کر بیان کرنا اور اس سے بڑے دلچسپ اور نئے نئے نکتے پیدا کرنا ہے۔

گویند ز رنگہا برون باید بود
دشوار حقیقتے کہ ماہم رنگیم

زندگی کے متعلق بیدل کا خیال ملاحظہ کیجیئے۔

در بخود سازیم جائے غیرت است
قید ہستی نیز تنگی بیش نیست

کبھی کہتا ہے کہ میرے محبوب کی زلفوں کے خیال میں مشک کی خوشبو ہے اسکے لئے نافہ ہرن سے مشک لانے کی ضرورت نہیں۔

پے نافہ ہای رمیدہ بو مسپند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرہے خورد زفتن درا

اس شعر میں بیدل نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔

ہمہ عمر باتو قدح زدیم ونہ آفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنار مابہ کنار ما

زہد و تقویٰ کہ متعلق بیدل کہتے ہیں کہ زہد و تقویٰ اپنی جگہ پر اچھی چیز ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں دل کا غلام ہوں یہ سب باتیں تو دردسر ہیں۔

زہد و تقویٰ ہم خوش است اما تکلف برطرف
درد دل را بندہ ام درد سری درکار نیست

اس دنیا و عقبیٰ کے متعلق بیدل کا خیال ہے کہ ان کے تخیل کی پیداوار ہے۔

چہ دام است دینا چہ نام است عقبیٰ
تو معماری این خانہ ہای گمان را

بیدل جنت کے تصور کو سکون دائمی سمجھتے ہیں اور سکون دائمی عدم کے برابر ہے۔

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید
جائے کہ یہ داغے نہ پتد دل چہ مقام است

بیدل کے پاس مذہب ایک روش ہے۔ منزل نہیں، اسکے سنگ ہائے سفر مقامات راہ ہیں مگر مقصد سے دور، آزاد لوگوں کا مشرب یہی ہے کہ مذہب کی قیود سے دور رہے۔

حسد تاکہ تعصب چتد گر درد دلی داری
نیاز زاہدان بے خبر کن در دینی را

حسد اور تعصب کب تک اگر احساس محبت رکھتا ہے تو مذہب کا شغف زاہدوں کو بخش دو۔

بیدل وحدت الوجود کے قائل ہیں۔

حق جدا از خلق و خلق از حق بروں اوہام کیست
تا ابد گرداب در آب است و در گرداب آب

یعنی خالق اور مخلوق ایک ہیں۔ ہمیں اپنی حقیقت کا احساس اس لئے ہوتا ہے کہ ہم حقیقت مطلق کے صفات کا مظہر ہیں۔ کائنات کے وجود کے متعلق کہتے ہیں کہ ایک لمحہ کا کام

ہے کن کا حکم ملا اور بن گئی جیسے ایک صفر کی تکرار سے اعداد بنتے ہیں۔

شور ہستی و عدم وقف سر پر خامہ بود
کاف و نون گل گردد چندین طشت شوق از بام ریخت

انکا خیال ہے کہ صفات کائنات واقعتاً وجود میں آئی۔ بیدل کہتے ہیں کہ حقیقت کے
یر بے حقیقت ہیں۔ اور یہ تمام کائنات "آدم" کی تخلیق کی تیاری تھی۔

لیک تصویر کامل اینجا نیست
جز ہیولی ز شخص پیدا نیست

اور آدم کی مٹی تمام کائنات کے اسرار پر حاوی تھی۔

جسم اصلی ہمیں کف خاک است
کہ محیط رموز افلاک است

بیدل نے آئنہ سے مضامین پیدا کئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عدم صوفیہ کے نزدیک علم
ن ہے اور یہ آئنہ کے مشابہ ہے۔ دنیا کی صورتیں بعینیہ اسی طرح جلوہ گر ہوتی ہیں جس طرح
نہ میں عکس منعکس ہوتا ہے۔

اندم کہ حقیقت قدم پیدا شد
دانی کہ چگونہ کیف و کم پیدا شد
رو دید ہستی آمد بہ وجود
خود را دید یم عدم پیدا شد

بیدل کے نزدیک اس دنیا کے علاوہ دوزخ، جنت، عذاب، ثواب یہ سب غلط ہے۔
ب کچھ اسی دنیا میں حاصل ہے۔

نشاط اینجا، بہار اینجا، بہشت اینجا، نگار اینجا
تو گر خود غافلی صرف عدم کن دور بینی را

بیدل کے نزدیک حال ہی اصلی شئے ہے ماضی و مستقبل صرف تغیرات ہیں۔ کائنات
نا نہیں ہوتی صرف اسکی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ دنیا مستقل حقیقت ہے جو ہر لحظ بدلتی ہے۔

چه دارد محفل تحقیق امروز است و بس
خاک بر فرق دو عالم و فردا کرده اند

بیدل دل کو بہت ہی عظیم سمجھتے ہیں۔

عرش و فرش اینجا محاط وسعت آباد دلست
کعبۂ مارا سواد از تنگی اطراف نیست

یعنی عرش و فرش کی تمام وسعتیں ایک دل میں آباد ہیں۔ اور اسکا جو سویرا ہے وہ کعبہ کی طرح ہے۔ بیدل انسان کی زندگی کو ذات باری کا پرتو سمجھتے ہیں وہ بالذات کچھ نہیں اسکا انجام فنا ہے۔

جز فنا صورت نہ بندد اعتبار زندگی
گر نبالد یا بخود پیچید نفس جزو ہوا ست

بیدل انسان کو مختار محض نہیں سمجھتے بلکہ اس کو مشیت ایزدی کا پابند سمجھتے ہیں۔ اور پھر بھی ایک حد تک وہ مختار رہے۔

این کہ مختار فعل نیک وبدیم
بیدل آئین اختیار نبود

تہمت حکم قضارا چارہ نتواں ساختن
اختیار از ماست چندانکہ مجبور یم ما

بیدل لذت نفس کو ترک کرنے اور بارگاہ ربوبیت میں انکسار و عجز سے بازیابی حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور انسان کی رہبری اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ اس کے قلبی واردات ہیں۔ بیدل کے اشعار میں استعارہ۔ واقعیت نگاری۔ معنی آفرینی۔ اور نئی نئی اصطلاحیں موجود ہیں۔ غرض کہ ان سب خصوصیات نے بیدل کے کلام کو بہت ہی دلچسپ بنا دیا ہے پہلے اہل ایران بیدل کے کلام پر توجہ نہیں دیتے تھے لیکن آج کل ایران میں بیدل پر بہت کام ہو رہا ہے۔ "سفینہ خوشگو" بندرا داس خوشگو کی کتاب ہے جو بیدل سے متعلق ہے۔

وہ بیدل کے شاگرد تھے۔

ڈاکٹر سید احسن الظفر نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بیدل پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ اس بارے میں "قند پارسی" کے شمارہ ۱۰ مجلہ میں شائع ہوا ہے جو خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ اسلام کی طرف سے چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے بیدل کے متعلق مختلف محققوں کی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اولاً ایرانی محقق و دانشمند بیدل کے کلام کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ لیکن آج کل ایران میں بیدل کا مطالعہ بحیثیت ایک فلسفی و صوفی شاعر کے کیا جارہا ہے اور اس کے کلام کو اہمیت دی جارہی ہے۔ دوسرے ایرانی شاعروں سے اس کے فکر و فن کا تقابل کیا جارہا ہے۔ بیدل کے کلام کی وسط اشیا میں شہرت کے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے۔

کلیات اشعار بیدل در سال ۱۲۹۹ در مطبع صفدری، بمبئی بہ چاپ رسیدہ است۔ پس از انکہ نسخ قلی "آثار بیدل" در آسیائی میانہ آمد منتخب غزلہا و رباعیات اور در کتب درسی گرفت (قند پارسی۔ م بیات۔ صفحہ ۴۴ شمارہ ۱۹۹۲۔ دہلی)

در تاریخ شعر تاجیک می خوانیم "خصلت شاعری "بیدل" ۔ ادب شناسان (برآن داشت تا قرن ۱۸ و ۱۹ ارا سدہ "بیدل" بنامند ("بیدل و مثنوی حالش "قند پارسی، م بیات صفحہ ۴۴ شمارہ ۱۹۹۲ دہلی)

غرض کہ بیدل کے کلام کو شہرت حاصل ہورہی ہے۔

غالب کا فکر و فن کلیات غالب کی روشنی میں

بود غالب عندلیب از گلستان عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستان نامیدمش

غالب خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ تورانی النسل ہیں۔تذکرہ مظہر العجائب میں غالب نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں۔یہ حالات موثق ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل ہیں۔ غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں اور دادا کا نام قوقان بیگ تھا۔مرزا کے والد سپاہ گری کرتے تھے۔وہ پانچ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔دستنبو میں خود غالب لکھتے ہیں

در پنج سالگی پدرم عبداللہ بیگ خاں بہادر ۔۔۔چراغ ہستی
فرومرد۔۔۔وگرامی اودر من پسر خواند و مرا پرورد"

نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش کی لیکن وہ بھی ۱۸۰۶ء میں ہاتھی سے گر کر ہلاک ہو گئے۔اس کے بعد اپنے نانا غلام حسین کے پاس رہے۔

غالب نے اپنے فارسی کلیات میں اپنے تورانی النسل ہونے کے متعلق خود لکھا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ھمی
بہ سترگان قوم پیوندیم
فن آبائی ما کشا و رزیست
مر زباں زادہ سمرقندیم

فارسی زبان سے غالب کو طبعی لگاؤ تھا اور اس میں ان کا مطالعہ بھی گہرا رہا۔جس شخص سے غالب نے فارسی زبان کے اسرار و رموز سیکھے "وہ درفش کاویانی" میں غالب نے اس کا نام



ہر مزملا عبدالصمد بتلایا ہے۔" مولانا ہر مزدم عبدالصمد ایں راز بامن می گفت (نقش آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر)

غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ھای رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ منست

اور پھر کہتے ہیں

منکران شعر من ہاں تا نگوی حاسدند
کایں قیاس از بہرشان سامان نانوی بودہ است

غالب نے انوری عرفی وخاقانی کو اپنا سلطان کہا ہے۔

انوری عرفی وقاقانی سلطان منم
پا دشہ طہورث وجمشید ہوشنگ منست

مرزا کو علم نجوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی اگرچہ طبیب نہیں مگر طب اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے فارسی کلام میں جابجا نجوم کی اصطلاحات اور احکام سے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔

بچپن میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے کر دی گئی تھی۔ جو غالب سے دو سال چھوٹی تھی (غالب از مولانا غلام رسول مہر صفحہ ۴۰) انہیں تمام عمر شادی کی بندھنوں کا رونا رہا اور بیوی کو بیڑی سے تشبیہ دی۔ مرزا غالب لاولد تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں ۷ بچے پیدا ہوئے لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئی کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور آخری عمر میں اپنے بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا تھا جو جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ غالب نے ان کا مرثیہ لکھا۔

مرزا کی طبعیت شراب کی طرف راغب تھی اور آخر دم تک وہ اس کو چھوڑ نہ سکے۔

غالب از مئے پرستی نگذرم
غوط در گرداب طوفان می زنم

مرزا غالب کی مفلسی و عسرت نے ان کی شاعری پر بہت اثر کیا۔ تمام عمر عسرت میں گذری۔ اور ہمیشہ قرض دار رہتے تھے خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بازار سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیا جاتا تھا (خطوط غالب خط ۲۲ صفحہ ۷۹)

حکومت انگریزی سے غالب کا تعلق بچپن سے تھا اور ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کے توسط سے پیدا ہوا۔ جب ۱۸۰۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو کارکردگی کے عوض ان کے متعقلین کی پنشن مقرر ہو گئی اور اس طرح سے مرزا غالب انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے۔ انگریزوں کی مادی ترقیوں کو دیکھ کر وہ اس سے مرعوب ہوتے۔ وہ شروع سے انگریزوں کے زیر اثر تھے اور کئی افسروں کی مدح میں انہوں نے قیصدے اور قطعے لکھے۔ انہوں نے "دستنبو" میں غدر کا مفصل ذکر کیا ہے۔ غدر کے دنوں میں غالب گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ غدر میں غالب کی جان اور آبرو محفوظ رہی لیکن مال لٹ گیا۔

غالب نے اپنے مذہب کے متعلق خود اپنے خط بنام علاء الدین خاں علائی میں لکھا ہے ملاحظہ ہو

"میں موجد خالص ہوں اور مومن کامل ہوں، زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل سے لاموجود الا اللہ اور لاموثر فی الموجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم ۔۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی ۔۔یہ ختم المرسلین اور رحمتہ العالمین ہیں، مقطع نبوت کا مقطع امامت اور امامت نہ اجماع بلکہ من اللہ ہے اور عام من اللہ علی علیہ السلام ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود برین زیستم ہم برین بگزرم" (خط ۲۲ بنام علا الدین خاں علائی خطوط غالب مرتبہ مہر صفحہ ۸۰)

غالب کو حضرت علی علیہ السلام سے والہانہ محبت تھی۔

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و باعلی دیوانہ ام

غالب نے بارگاہ رسالت میں جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ دنیا میں اور آخرت میں ان کے لئے باعث نجات ہے۔

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است
آرے کلام حق بہ زبان محمد است
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

غالب مذہبی تصنع کے مخالف تھے۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی وشرابے وسرودے
زنہار ازاں قوم بناشی کہ مریبند
حق را بسجودے ونبی رابہ درودے

دین کے متعلق غالب کا نظریہ ہے۔

مقصود ما ز دیر وحرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

کبھی کہتا ہے کہ ہم سے بخشش کا وعدہ بھی ہے اور گناہوں سے منع بھی کیا گیا ہے۔

ہم وعدہ وہم منع ز بخشش چہ حساب است
جان نیست مکرر نتواں داد شرابست

اور کبھی کہتے ہیں کہ زہاد جہاں اصطلاحات میں رہنما کی وجہ سے ششں وپنج میں پڑجاتے ہیں وہاں اہل دل حقیقت تک پہونچ جاتے ہیں۔

مخمور مکافات بہ خلد وسقر آویخت
مشتاق عطا شعلہ زگل باز ندانست

غالب کے نزدیک یہ بہشت ودوزخ عوام کو نیکی پر کاربند رکھنے کے لئے ہیں

ہنگامہ دلکش دست نویدم عبہ خلد چیست
اندیشہ بے عشق است نیازم بہ بندیست

غالب کے نزدیک ملتیں اگر مٹ جاتی ہیں تو اجزا ے لماں ہوجاتی ہیں

مائیم ذوق سجدہ چہ مسجد چہ میکدہ
در عشق نیست کفر ز لماں شناختن

غالب کا فارسی کلام نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا جو منشی نولکشور نے ان سے حاصل کر کے ۱۸۶۳ء میں اپنے مشہور مطبع میں چھاپا۔

فارسی میں دس ہزار چار سو چوبیس اشعار از قسم ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، قصیدہ، غزل رباعی کلیات میں جمع کئے گئے ہیں۔ اس میں سید الشہداء کے نوحہ بھی ہیں جس میں سے ایک نوحہ کا مطلع یوں ہے۔

ای فلک شرم از ستم بر خاندان مصطفیٰ
داشتی زین پیش سریر آستان مصطفیٰ

دوسرے کا مطلع یوں ہے

اے کج اندیشہ فلک حرمت دین بایستی
علم شاہ نگوں شد نہ چنین بایستی

اور حضرت علی کی شان میں ایک مخمس ہے

در مہد دستبرد بہ اژدر کند علی
رفع نزاع باز و کبوتر کند علی
از جور چرغ پرسش من گر کند علی
زور آزمائی کہ بہ خیبر کند علی
دانم ہمان بہ گنبد پیدا کند علی

اس فارسی دیوان میں گیارہ مثنویاں شامل ہیں جو زبان و بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ظ انصاری صاحب نے ان مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے

ہیں کہ "قطعی مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ غزلوں میں یہاں وہاں جو خیالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں وہ ان مثنویوں میں ایک سلسلے اور ترتیب کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں ہمارے شاعر کا پورا وجود، باطنی وجود، خیالات کی رو، زندگی اور فن سے اس کا برتاؤ، تیکھا برتاؤ، آدم زاد اور آدم ساز کے رشتے میں جبر و اختیار کی کش مکش روزمرہ کے مسائل و معاملات میں الجھنے اور سلجھنے کی ضرورت یا مصلحت، فرش پر رینگنے اور عرش پر اڑان بھرنے میں اس کا دم خم ایسے بیان ہوا ہے کہ! ان مثنویوں کے مطالعے میں غالب کی مکمل سنجل شخصیت سے بھرپور تعارف ہوگا اور غالب شناسی ایک قدم آگے بڑھے گی۔" (مثنویات غالب۔ظ انصاری۔ دہلی ۱۹۸۳ء) "سرمہ بینش" بہادر شاہ ظفر کی مدح میں "چراغ دیر" بنارس کی تعریف میں "باد مخالف" کلکتہ۔ والے ہنگامہ کے متعلق "تبرکات" اور "ابر گہربار" غزوات نبوی کے منظوم تذکرہ کا مقدمہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔

سالہا سال "غزوات رسول" نظم کرنے کی فکر میں رہے مگر جب دیکھا کہ موضوع ان کے قابو سے باہر ہوا جارہا ہے تو اس پر فاتحہ پڑھ دی۔ اس کو غالب کی شاعری کا مزاج اور نقطہ عروج کہنا چاہیے۔ظ انصاری لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹ویں صدی کے فارسی شعری خزانہ میں اس سے ابدار گوہر ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ اس خزانہ کا بے مثل جواہر پارہ ہے۔ اپنی ایک مثنوی "درد و غم" میں غالب نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بے نصیب کاشتکار تھا جو مفلس تھا اور اس کی ایک بیوی اور لڑکا تھا یہ تینوں عسرت و مصیبت سے پریشان ہو کر نکل پڑے اور بھوک و پیاس کی شدت سے بے چین ہوگئے ان کے پاؤں میں آبلہ پڑ گئے تھے۔ اور جند جلنے کی نوبت آگئی تھی یکایک انہیں اس صحرازمین ایک جگہ پرندوں کا ہجوم نظر آیا یعنی زندگی کی نشانی ملی اور انہوں نے دیکھا کہ اس سنسان بیابان کے گوشے میں کسی صحرانشین کا ٹھکانا تھا اور انہوں نے اس درویش سے پانی طلب کیا جب زبان تر ہوگئی تو انہوں نے درویش سے اپنی مراد عرض کی اور تینوں نے اپنا دکھڑا بیان کیا اور اس سے استدعا کی کہ ان کے لئے دعا کرے۔ وہ درویش صحرانشین ان کے بیان سے متاثر ہوا اور جب اپنے دل میں ان کے متعلق سونچا تو اس کی آنکھوں کے آگے ان کی تقدیر آگئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ ان کی قسمت میں سوائے

محرومی کے کچھ نہیں ہے۔ اور ان پر بخشش کا دروازہ بند ہے۔ اس درویش نے پھر بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر دعا کی کہ ان کو بخش دے اور ان پر رحم کر۔ لیکن بارگاہ خداوندی سے آواز آئی کہ ان کی تقدیر کا جو حال تھا تجھ کو بتلا دیا گیا ہے اگر پھر بھی تو کرم کا خواہاں ہے تو ان کو یہ مژدہ سنادے کہ یہ تینوں مجھ سے ایک ایک تمنا بیان کریں اور یہ تینوں کی صرف ایک ایک تمنا پوری ہوگی۔ اور پھر تم ان دعاؤں کا ماجرا دیکھنا۔ اور اس مرد بزرگ نے ان سے یہ ماجرا کہہ سنایا۔ اور کہا کہ جو کچھ تم کو چاہیے مانگ لو۔ وہ لوگ خوش خوش تالیاں بجاتے ہوئے جانے لگے بڑھیا نے جس کا دل ابھی جوان تھا اس نے خیال کیا کہ اگر بوڑھے کے پاس دولت آجائے گی تو عیاشی کرے گا اور مجھے چھوڑ دے گا لہذا اس نے سب سے پہلے دعا کی کہ پروردگار مجھے جوان کر دے اور دنیا بھر کے حسینوں میں امتیاز عطا کر دے۔ اور زلیخا کی طرح میرا شباب لوٹا دے۔ جیسے ہی اس نے سجدہ سے سر اٹھایا تھا کیا دیکھتی ہے کہ وہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہی ہو گیا۔ وہ بالکل مورنی سی بن گئی۔ وہ بوڑھا اس خوبصورت جوان عورت کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا اور گھر کی طرف چلا۔ اور گھر سے کچھ فاصلہ پر اچانک جنگل میں غبار اٹھا اور اقبال مندی کی ہوس ختم ہو گئی۔ اور اس سے ایک شہزادے کا جلوہ ابھرا۔ کسان کی عورت سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جب اس نے اپنے پھندے میں کسان کی عورت کو کس لیا تو بیچاری عورت نے اپنا رنگ بدلا۔ اس کے دل سے بوڑھے کسان کی محبت نکل گئی اور وہ اس جوان کی آغوش میں جانے کی ہوس کرنے لگی۔ اور اس نے رونا پیٹنا شروع کیا کہ اے نوجوان میری مدد کر میں ان ڈاکوؤں کے جنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اس نوجوان نے اس کی مدد کا ارادہ کیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالکر گھوڑے پر پیچھے بٹھالیا۔ اور رہوا ہو گیا۔ بوڑھا حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اور وہ اس کے لئے بد دعا کرنے لگا اس نے دعا کی کہ اس کا چہرہ بگاڑ کر اسے سورنی بنادے۔ ابھی وہ بوڑھا سجدہ سے سر بھی نہ اٹھایا تھا کہ وہ عورت سورنی بن چکی تھی اور شہزادہ اس کو بھوت پریت سمجھ کر خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے گھوڑے سے دھکا دیکر اسے گرا دیا۔ اور پھر وہ بڑھیا اپنے بیٹے اور شوہر کی طرف دوڑی۔ اور ان کے قدموں پر عاجزی اور خوشامد سے لوٹنے لگی یہاں تک کہ اس کے بیٹے کا دل بھر آیا اور اس نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی کہ اس کی ماں

کو اس کی پہلی حالت پر لوٹا دے۔ اور اس کی دعا مقبول ہوئی پھر وہ عورت وہی بڑھیا بن گئی۔
یہاں پر غالب اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔

غالب اگر محرم معنی شوی
آئنہ پرداز تسلی شوی
تا بنود یاری بخت بلند
چارہ عیسیٰ نفتد سود مند

رحمت حق جوش عطاہا نمود
رنگ اثر صرف دعا ہا نمود
شد سہ دعا باہمہ لطف اثر
صرف علاج سہ بلائے دگر

یعنی جو تقدیر کا لکھا ہے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہوتا ہے۔

غالب کو لوگ بیدل کا خوشہ چین کہتے ہیں۔ غالب کی جدت پسندی نے فارسی گوئی کے لئے راہ الگ نکال لی تھی اور فارسی کلیات میں غالب نے بیدل کو ان شعرا میں نہیں گنوایا جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔

غالب نے اپنے لئے شعر گوئی کے محرکات غمزدگی اور غم دوست قرار دیا ہے سچ تو یہ ہے کہ اگر غالب کی زندگی میں غم نہ ہوتا تو غالب غالب نہ ہوتے۔ اپنی مثنوی "مغنی نامہ" میں لکھتے ہیں کہ مجھے غم نے عقل سکھائی۔ اور غم مجھے بہشت سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں تو ایک دردمند ہوں تیری سخن سرائی میں غم کے سوا اور کوئی چیز کار فرما نہیں۔

بدانش غم آموز گار من است
خزاں عزیز ان بہار من است
غمے کز ازل حد سرشت من است
بعد دوزخ اما بہشت من است

دہم ہمچو غالب بہ غم شاد باد
بدیں شیخ ویرانہ آباد باد

احساس غم نے غالب کو قنوطیت پسند بنا دیا تھا وہ خود کہتے ہیں کہ احساس غم نے صبح وشام کا فرق مٹا دیا ہے۔

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر وشام ندارد

روایات کے مطابق غالب نے قصیدہ کو اپنی علمیت اور کمال فن کے اظہار کا بہترین آلہ سمجھا۔چونکہ انہیں اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اسی لیے ان کے کلیات فارسی کا ایک بڑا حصہ قصیدوں پر مشتمل ہے۔انہوں نے چوسٹھ قصیدے کہے ہیں۔ایک حمد میں۔دو نعتیہ، دس حضرت علی اور ائمہ علیہ السلام کی مدح میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی اور پندرہ قصاید ابو ظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی کی مدح میں تین قصائد ملکہ وکٹوریہ اور ان کے جانشین اور چودہ قصائد۔انگریزوں کی مدح میں ہیں۔جس میں سر چارلس مٹکاف۔لارڈ ہارڈنگ، مسٹر فریزر قابل بیان ہیں۔سات قصائد دیگر امرا سرکار اودھ اور گیارہ قصائد دیگر امرا اور نوابین کی مدح میں کہے ہیں۔

قصائد میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔مرزا کی چستی اور زبان کی برجستگی عقل کو حیران کر دیتی ہے۔مدح میں قافیہ کا طریقہ جداگانہ دعا کا اسلوب نرالا اور ترتیب یوں ہے کہ غالب اپنی تعریف اور ممدوح کی تعریف ہم آہنگ کرتے ہیں۔عام طور پر ممدوح کی بے جا تعریف سے اجتناب کیا ہے۔

غالب کی بلاغت کی ایک اچھی مثال حسب ذیل شعر ہے۔

جنوں محمل بہ صحرائے تحیر راند است امشب
نگہ در چشم وآہم در جگر وامانده است امشب

معشوق کا خود عشق میں گرفتار ہونا طرفہ تماشا ہے۔غالب نے اس کیفیت کو اکثر مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔

شکستہ رنگ تو از عشق خوش تماشا ایست
بہار دہر بہ رنگینی خزاں تو نیست

غالب نے اسی مضمون کی اردو میں اس طرح تفسیر کی ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے

رند اگر خدا کی اطاعت نہیں کرتے تو وہ بشرط استواری ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کی پرستش میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے۔

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

چاند اور محبوب کے چہرہ کو تشبیہ عام طور پر دی جاتی ہے لیکن غالب کا طریقہ کچھ اور ہے

چوں بہ سنجد کہ نہ آں است بکاہد از شرم
ماہ بکوشد ببالد کہ جبین تو شود

یعنی ماہ کچھ دن تک بڑھنے کی کوشش کرتا ہے کہ معشوق کے رخ کی برابری کرے مگر جب کامل ہو کر مقابلہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو بے حقیقت پاتا ہے تو شرم سے گھٹنے لگتا ہے۔

معاملہ بندی ملاحظہ ہو جو واقفیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

اور ایک خصوصیت معنی آفرینی ہے۔ اور معنی آفرینی ملاحظہ ہو

خاک کوئش خود پسند افتاد در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

یعنی محبوب کے کوچہ کی خاک میرے سجدہ کو کھینچنے کے لئے اتنی خود پسند واقع ہوئی کہ میری پیشانی پر سجدہ کے لئے بھی جگہ نہیں چھوڑی۔

شب فراق کے متعلق کہتے ہیں

شب فراق ندارد سحر ولے یکچند
بہ گفتگوے سحر میتوال فریفت مرا

غالب کہتے ہیں کہ کرم بہانہ جو ہے بخشش کے لیے وہ عمل کو نہیں دیکھتا۔

بہانہ جو ست کرم زاں گذارش کار
بنودہ حسن عمل را علاقہ توفیق

غالب ناکردہ گناہوں کے بھی حسرت کی دادیوں طلب کرتے ہیں

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش باما سخن از حسرت مابیز کنند

غالب کی فکر میں رسائی اور بلندی تخیل موجود تھی۔ فارسی زبان کے الفاظ اور محاوروں پر انہیں کامل عبور تھا۔ اور وہ اپنا کمال بھی دکھلانا چاہتے تھے۔ اور جدت واچھوتا پن بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ غالب نے قافیہ استعمال کی ضرورت سے بھی شعر پیدا کیا ہے۔ بعض غزلوں میں اعمال واحوال کے قوافی آگئے ہیں۔ غالب کا تخیل روایات کی حد بندیوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اظہار خیال کے لئے راہ الگ نکال لیتے ہیں۔ غالب چاہ زنخدان کے متعلق ایک شعریوں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص چاہ میں گر جاتا ہے تو غل مچاتا ہے۔ اسی طرح ذلت نے منہ پر اندھیرا کر رکھا ہے اور دل راہرو کی مانند چاہ زنخدان میں گر جاتا ہے تو فریاد کرتا ہے۔

خروش و زاری من درسیاہی شب زلف
دم فتادن دل درچہ ذقن یاد آر

ایران میں غالب کو فارسی زبان کا شاعر ہی نہیں مانا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ایرانی غالب کے فارسی کلام کو پڑھنے لگے اور اس کے فکر وفن کو سمجھنے لگے لیکن آج بھی غالب کو ہندوستان میں شاعری کے لحاظ سے جو درجہ حاصل ہے وہ ایران میں نہیں۔



پروین اعتصامی

پروین اعتصامی شعر کے آئینہ میں

کسی شاعر کی شاعری کو سمجھنے سے پہلے اسکے زمانہ کے حالات اور عواملات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پروین دور مشروطیت کی شاعر ہے تو ہمیں اسکے اشعار کو پڑھنے سے پہلے اس کے زمانہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس وقت ایران میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ناصر الدین شاہ کی مطلق العنانی برطانوی سامراجیوں کی ٹھیکہ داروں کے بڑھتے ہوئے نفوذ نے ملک میں ہر طرف افلاس بیروزگاری اور غربت کو پھیلا دیا تھا۔ لوگوں میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں شدید بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کچھ منصوبوں کے قیام اور ٹیلگراف لائین، ریلوے اور پریس کی توسیع اور سائینسی علوم سے تعارف ایرانی سماج میں ایک طبقہ کو بیدار کر رہا تھا اور لازماً اس نئے طبقہ کے ساتھ نیا جمہوری شعور بھی ابھر رہا تھا۔ وطن دوستی اور اپنی ذلت کا احساس ذہنوں کو چونکا رہا تھا۔ اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے دلوں میں دبی دبی اس چنگاری کو شعلہ بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے اپنے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور دوسروں کو بھی اس کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن کچھ لوگوں نے اپنے دور کے ہنگاموں سے ڈر کر پیچھے مڑ کر دیکھنا شروع کیا اور قدما کے طرز کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا ڈالا۔ مثلاً فتح علی خاں صبا، لطف علی آذر، قائم مقام، سروش، شہاب، قاآنی وغیرہ لیکن جہاں تک Content کا سوال ہے اس میں بہت کچھ نیا پن تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی دوسری طرف ایسے لکھنے والے پیدا ہوتے جنکی نظر زیادہ وسیع تھی جن کے حوصلے زیادہ بلند تھے جن میں زیادہ جرات تھی انہوں نے افراتفری کی سیاہ رات کے بیچ میں مستقبل کی روشنیوں کو دیکھا اور اپنے قلم کے ذریعہ امید کی روشن کرنوں کو عوام کے دلوں تک پہنچایا۔ ان کو ہم فارسی کی جدید شاعری کے بانیوں اور معماروں میں شمار کر سکتے ہیں۔

پروین اعتصامی کا نام ایران کی افق شاعری پر اسی زمانے میں نمودار ہوا اس کی زندگی بھی مختصر تھی اور کلام بھی مختصر۔ لیکن جتنا کلام ہمیں ملتا ہے اس میں ہمیں ایرانی عوام کے لئے

واقعی پرخلوص جذبہ ہمدردی ملتا ہے ۔پروین کے والد اعتصام الدولہ خود ایک اچھے شاعر ومترجم تھے اور پروین نے انہیں سے تعلیم وتربیت پائی ۔رضاخاں کی تخت نشینی کے وقت وہ صرف دس سال کی تھی اور ۳۵ سال کی عمر میں اس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

اسماعیل حاکمی صاحب اپنی کتاب ادبیات معاصر کے صفحہ ۲۷ پر پروین کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

"پروین دختر مترجم ونویسندہ دانشمند مرحوم یوسف اعتصامی (اعتصام الملک) بود از کودکی استعداد شاعری او آشکار شد وباآنکہ زندگیش زود بہ سرآمد درھمان جوانی در شاعری شہرت یافت ۔سی وپنج سال عمر او ھمراہ باافسردگی ھا واندوہ بسیار گذشت ۔زبان پروین بہ زبان شاعران کہن از قبیل: منوچہری، ناصر جزو، سعدی، مولوی وحافظ نزدیک است ۔وی در اشعار خود از تمثیل وحکایت وقصہ بسیار استفادہ کردہ است ۔پروین در سال ۱۳۲۰ شمسی درگذشت ودر قم بہ خاک سپردہ شد"

پروین کا مزار قم میں امام رضا علیہ السلام کی بہن حضرت فاطمہ جنہیں معصومہ قم کہا جاتا ہے ان کے روضہ کے صحن میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہے ۔جناب ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر صاحب اپنے ایک مقالہ "گنج حقیقت نگاھی بہ شعر واندیشہ پروین وکتاب شناسی او" میں جو قند پارسی کے شمارہ ہشتم میں چھپا ہے پروین سے متعلق اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"سخن از پروین ستارہ درخشان شعر آسمان ادب ایران است ۔شاعری درد آشنا اما صبور، باشعری سادہ وبی ریا ودر عین حال عمیق، در خدمت مردم زمانہ اش پروین زنی بود کہ مردانہ بہ پاخاست وشعر خود را ہمچوں سلاحی بران در مبارزہ باد غلکاران وستمگاران وھمہ مصائب بشری بہ کار برد"

اور آگے لکھتے ہیں کہ وہ تبریز میں پیدا ہوئی اور تہران کے امریکن کالج میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸ سال کے سن میں اس کالج سے فارغ التحصیل ہوئی ۔ازدواجی زندگی میں اس کو شکست ہوئی اور اسی ناکامی کی وجہ سے بستر مرگ سے لگ گئی اور ۳۵ سال کی عمر میں اس جہاں سے سفر

کیا۔اس کی زندگی نشیب و فراز سے پر تھی ایک طرف تو سیاسی اور اجتماعی حالات اور دوسری طرف مالی اور اخلاقی حالات نے اس کے درد مند دل کو بہت رنجیدہ کر دیا۔یہ زمانہ آزادی خواہوں اور روشن فکروں کے لئے تنگ ہو گیا تھا۔کیونکہ ذرا سی بھی تحریک کی جاتی یا جنبش ہوتی تو بری طرح حکومت کی طرف سے سرکوبی کی جاتی تھی۔اس دور میں بعض اہل قلم کو قید کی صعوبتیں اٹھانا پڑا بعض لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کچھ نے مثل لاہوتی راہ فرار اختیار کی پروین نے جب خود میں حکومت کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ پائی تو مناظرہ کے قالب میں اور تمثیلی طور پر اپنے اشعار میں خیالات کا اظہار کیا۔پروین نے ایران کی روایتی شاعری کو مغرب کے قلب میں ڈھالا اور ایک نیا طرز پیدا کیا۔انہوں نے انسانی فکروں اور سماجی حالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔پروین نے اپنے احساس غور و فکر کو بلند خیالی اور نرم و ہموار زبان میں عوام کے سامنے پیش کیا۔اور اپنے اشعار میں تمثیل کے طور پر اخلاقی و سماجی مسائل کو پیش کیا۔پروین کی نظر تیز اور محققانہ تھی اس نے اپنے مضامین و موضوع کے انتخاب میں اخلاق، اصلاح و بہبودی عوام کو ترجیح دی۔

محمد اسحاق ندا اپنی کتاب " ادبیات نوین ایران "ترجمہ و گرد آوری یعقوب آرژند" کہ صفحہ ۱۸۔تہران ۱۳۶۳ف میں لکھتے ہیں:

"بانیکہ باید پذیرفت کہ او در بعضی ازاین اشعار مناظرہ ای موفق است ولی بقیہ اشعار مناظرہ ای او کسل کنندہ و خستگی زاست۔

ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر اپنے متذکرہ بالا مضمون کے صفحہ ۱۹۷ میں شعر پروین سے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

شعر پروین آمیزہ ای از معارف عرفانی و آموزش ہای اخلاقی و برگرفتہ از تعالیم قرآنی و احادیث ائمہ (علیھم السلام) است۔شعر او پیوند ذہنیت و طنیت است او ارزش ہائی انسانی را در شعر مطرح می کند و راہ اصلاح جامع را از اندر زہای اخلاقی می داند۔او شاعری واقع بین و خرد گرا است۔شعر او نتیجہ گرہ خوردگی اندیشہ والای گذشتہ و حال است کہ متضمن بیان مسوولیت ہائی

اجتماعی عصر و زمان شاعر نیز می باشد۔

دہ خدا بھی مقدمہ دیوان پروین چاپ تہران ۱۳۱۴ھ میں پروین کے اشعار کو سلیس و متین و ہم شان شعر استادان قدیم سمجھتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ پروین کے اشعار سوز دروں رکھتے ہیں اور عوام وانسانی درد کو شعر میں پیش کرتی ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پروین کے خیالات جو متعلق بیان کئے ہیں وہ اس کا تجزیہ نہیں ہے لیکن اس نے افلاس۔فقر اور رنج کا مزہ نہیں چکھا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق دولت مند طبقہ سے تھا۔اور اس کے اشعار صرف فرانسیسی نالوں وہیکٹر ہیگو کے اثر کے تحت ہے۔

پروین نے اپنے اشعار میں ایرانی عورتوں کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے اور اپنے زمانے کی سماجی واقتصادی حالات کی یہ تصویر کشی کی ہے۔اس کے اشعار میں ایران کی عورتوں کے دل کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔وہ عورتوں میں بیداری کی قائل ہے۔

ڈاکٹر سید تقی علی عابدی اپنی کتاب جدید فارسی شاعری کے صفحہ ۱۸۶ پر جو ان کا پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔اور لکھنو سے ۱۹۸۸ء میں چھپا ہے اس طرح لکھتے ہیں:۔

"پروین اعتصامی کا نام جدید فارسی شاعری کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جاتا ہے۔ان کی ادبی جدوجہد ایسے زمانہ میں شروع ہوئی جب شاعری تین طبقوں میں بٹ چکی تھی۔پہلی قسم کی شاعری روایتی انداز کی شاعری تھی۔ یعنی جس میں معاصر شعراء نے کلاسیکی انداز بیان کی پیروی کی (خواہ وہ طرز خراسانی ہو، عراقی ہو یا ہندی) دوسری قسم کی شاعری وہ تھی جس میں قدیم روایتی شاعری کے قواعد و اوزان وقافیہ سے رشتہ توڑے بغیر فقط لفظی اور معنوی تبدیلی کی گئی تاکہ وہ وقت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوسکے۔اس قسم کی شاعری کو عہد جمہوریت کی شاعری بھی کہا جاسکتا ہے اس کے بعد تیسری قسم کی شاعری کے بانی نیما یوشیج ہیں۔بہر حال پروین اعتصامی نے دوسری قسم کی شاعری کو اختیار کیا۔ان کی شاعری شکل کے اعتبار سے کلاسیکی پیرایہ بیان کی اور معنی کے اعتبار سے جدید رجحانات کی حامل ہے۔

کیوں کہ انہوں نے وزن وقافیہ سے رشتہ توڑے بغیر فقط لفظی و معنوی تبدیلی کی۔اس تبدیلی کے ساتھ انہوں نے اپنے اشعار میں سماجی حالات کے نشیب وفراز کا مکمل احاطہ کیا۔ان کی شاعری کا مرکزی خیال بے انصافی سے نفرت و بیزاری اور حق وسچائی سے الفت و محبت ہے۔انہوں نے اپنی بات کو چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ذریعہ بتایا۔اور ان ہی کے ذریعہ انسانی، اخلاقی اور سماجی حل تلاش کیے۔"

ڈاکٹر رضیہ اکبر صاحبہ کا خیال ہے کہ پروین اپنے بہت سے اشعار میں ایک مادر مہربان کی طرح اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔پروین حق کی متلاشی ہے۔اس وجہ سے زندگی کی تلخیوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہے اور بہت ہی خاص مہارت کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو اس کی نشان دہی کرتی ہے۔علم وہنر کو پروین ہر چیز پر ترجیح دیتی ہے اور لوگوں کو علم حاصل کرنے کی اس طرح اپنے اشعار میں ترغیب دیتی ہے۔

گویند عارفان ہنر وعلم کیمیاست
وآن میس کہ گشت ہمہ این کیمیا طلاست

وقت کی قدر کرنا سکھاتی ہے؟

وقت گذشتہ را نتوانی خرید باز
مفروش خیرہ ، کاین گہر پاک بی بہاست

زہد کہ متعلق کہتی ہیں:-

زہد بہ نیست پاک است نہ بہ جامہ پاک
ائَی سن آلودہ کہ پاکیزہ ردائی دارد

پروین اپنی ایک نظم "گوہراشک" میں امیری وغریبی کا فرق بتلاتی ہیں:

آن نشیندند کہ یک قطرہ اشک
صبحدم از چشم یتیمی چکید

برد بسی رنج نشیب وفراز
گاہ در افتاد وزمانی دوید
گاہ درخشید وگہی تیرہ ماند
گاہ نہاں شد وگہی شد پدید
عاقبت افتاد بدامان خاک
سرخ نگینی بسر راہ دید
گفت کہ پیشہ ونام توچیست
گفت مرا با توچہ گفت وشنید
من گہر ناب وتو اک قطرہ آب
من زازل تو ست وپلید
دوست نگردید فقیر وغنی
یار نباشد شقی وسعید

پروین لوگوں کو عمل کی دعوت دیتی ہے تقدیر پر تکیہ کرکے بیٹھ رہنے سے منع کرتی ہے۔

کار خود را ہمہ بادست تو کرد
نفس جز دست تو افزار نہ داشت

وہ کہتی ہے کہ آج کی لڑکی کل کی ماں بن جائے گی اور اس کی اولاد سے اس کا رتبہ بلند ہوگا وہ عورت کی عظمت کو بتلاتی ہے اور اپنی نظم مرد وزن میں کہتی ہے کہ ایک کشتی ہے اور دوسرا ملاح ہے اگر ملاح عقل مند نہ ہو تو کشتی ڈوب جائے گی
۔اور کبھی کہتی ہیں کہ جس گھر میں عورت نہ ہو اس گھر میں شفقت و محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔

در آن سرای کہ زن نیست انس وشفقت نیست
در آن وجود کہ دل مرد ، مردہ است روان

پروین نے پردہ سے متعلق ایک نظم "زن در ایران" کے نام سے لکھی جس کے ذریعہ

بتایا کہ سادگی، پاکی اور پرہیزگاری عورت کے زیور ہیں۔

سادگی وپاکی وپرہیز یک یک گوہرند
گوھر تابندہ باتنہا گوہر کافی بنود

پروین کے اشعار اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ انہوں نے ایرانی حکومت اور ہمناؤں پر طنز کیا ہے اور دوست دشمن کی پہچان اور پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ سے معاہدہ کو ملت فروشی سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے کمزور اور مزدور طبقہ کی ہمدردی بھی کی ہے۔ ر اس کے متعلق نظم "سہ قطرہ خون" لکھا ہے۔ پروین نے "اشک یتیم" کے نام سے ایک ت ہی خوبصورت نظم لکھی جو سامعین کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہی ہوں۔

روزی گذشت پادشہی از گذرگہی
فریاد شوق برسر ہر کوئی وبام خاست

پرسید زان میانہ یکی کودک وتیم
کاین تابناک چیست کہ برتاج بادشاہت

آن یک جواب داوا کہ دانیم ماکہ چیست
پیداست آنقدر کہ متاعی گرانبھامت

نزدیک رفت پیر زنی کوژ پشت وگفت
این اشک دیدہ من وخون دل شما است

غرض یہ کہ پروین کے کلام میں سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ اخلاقی، اصلاحی وپند یز مضامین بصورت تمثیل پائے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں بہت دلکشی بھی ہے گہرائی اور یرائی بھی

پروین نے عورت کو اپنی شاعری کا موضوع تو بنایا مگر نئے انداز سے کیوں کہ وہ مغربی ب سے روشناس تھی جس میں صرف حسن وعشق کا میدان ہی نہیں بلکہ قدرتی مناظر کے

ساتھ ساتھ مذہب، سیاست، سماج، حب وطن اور عورت کی کاروباری زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔اور اس طرح عورت کو عمل کا پیغام دیا۔اور عورت کو ملک و قوم کا ایک اہم رکن مانا۔جس کے کندھوں پر ملک و قوم کی ذمہ داری ہے۔وہ اگر چاہے تو ملک و قوم کی عزت وآبرو کو دوبالا کردے اور اگر چاہے تو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم "فرشتہ انس" میں اس بات کا اظہار کیا ہے۔دوسرے جدید شعراء کی طرح پروین بھی قسمت کی قائل نظر نہیں آتی۔ان کا خیال یہ ہے کہ قسمت انسان کے ہاتھ میں ہے۔انہوں نے قسمت پر قناعت کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہا:

دیوانگی است قصہ تقدیر وبخت نیست
از بام سرنگوں شدن وگفتن این قضاست

پروین نے اپنی ایک نظم "تخت بی بر" میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ اگر بغیر پھل کا درخت ہو تو اس کی قسمت میں ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو کاٹ دیا جاتا ہے۔یہ تبرد درخت کے مکالمہ کی صورت میں ایک تمثیل پیش کی گئی ہے۔انجام کار درخت کو کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔اور شعلہ ولکڑی کا مکالمہ اس طرح بیان کیا ہے:

خندید بر اوشعلہ کہ : از دست کہ نالی
ناچیزی توکرد بدین گو نہ تورا خوار
آن شاخ کہ سر بہ کشد ومیوہ نیارد
فرجام بہ جز سوختنش ھست سزاوار
جز دانش وحکمت بنود میوہ انساں
ای میوہ فروش ہنر! ایں دکہ بازار
از گفتہ ناکردہ بیہودہ چہ حاصل
کرد انکو کن ، کہ نہ سودی از گفتار

پروین کہتی ہے کہ جو درخت میوہ نہ رکھے اور غرور کرے تو اس کو جلا دینا ہی بہتر ہے۔انسان کے لیے سوائے دانش وحکمت کے کوئی چیز بہتر نہیں۔اے ہنر فروش اس بازار میں سوائے

کردار نیک کہ کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی بیکار بیہودہ باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ ہنر پیدا کرے اور کام کرے تو ضرور اس کو فائدہ پہنچے گا۔

پروین اپنی ایک اور نظم ہنر و علم میں کہتی ہے کہ ہنر و علم کیمیا ہے اور جو بھی اس سے مس ہوتا ہے سونا بن جاتا ہے۔ اور کہتی ہے کہ وقت گذشتہ کو تو دوبارہ نہیں پاسکتا یہ ایک بیش بہا گہر ہے تن پروری سے منع کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ انسان کی دولت فضیلت سے ہے۔ اور ایسے آدمی سے ڈرو جو شیطان کا دوست ہے۔ اور کہتی ہے کہ۔

آن را کہ دیبہء ہنر و علم در برست
فرش سرای اوچہ غم ارز آنکہ بوریاست

جس آدمی کے پہلو میں علم و ہنر ہے اگر وہ بوریہ پر بیٹھا ہو تو کوئی غم نہیں۔ بلندی و پستی تو علم کی فضیلت سے ہے۔

پروین کے آثار میں دیوان پروین ہے۔ حسب ذیل میں قصیدہ، مثنویات اور نظمیں ہیں۔ کلیات دیوان ہے جس میں قطعات منتخب نظمیں اور چند اشعار ہیں۔

علی دھباشی نے پروین کے نظموں کا انتخاب ۱۳۸۸ھ میں تہران میں چھاپا ہے جو ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

م نور بخش نے اصفہان سے ۲۲۹ صفحہ پر مشتمل ایک انتخاب قطعات پروین شائع کیا ہے جو ۳۴۳ شمسی میں چھپی

۳۲ صفحات پر مشتمل ایک دیوان شعر پروین کے نام سے کتاب چھپی ہے جوش وزیری نے ۱۳۱۴ شمسی میں چھاپا ہے اور ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ تہران سے چھپی ہے۔

مقدمہ اور سپاشناسی کے ساتھ حشمت موید نے شکاگو سے "دیوان پروین اعتصامی" منتشر کیا ہے۔

ابو الفتح اعتصامی نے تہران سے ایک دیوان پروین اعتصامی شائع کیا ہے جو ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

دیوان قصاید و مثنویات گب سوسائٹی سے وزیری نے ۳۴۲ صفحات پر چاپ کیا ہے۔

میردی نے، دیوان قصاید، مثنویات و تمثیلات و مقطعات خانم پروین اعتصامی ۲۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ عباس رجبی نے "گل چینی از دیوان پروین اعتصامی" کے نام سے پاکٹ سائز کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل منتشر کی ہے۔ اور اسی عنوان سے یعقوب پیری نے ایک انتخاب تہران سے ۲۴۰ صفحات پر منتشر کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادبیات انقلاب اسلامی کی جھلکیاں

ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر

ترجمہ ڈاکٹر زیب حیدر

ایران میں ادب انقلابی ایک خاص خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوا اور پھیلا اور ایک انقلابی عمل کی طرف رجوع بکار ہے۔ بغیر کسی جھجک کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پیدائش کے محرکات، وسعت و رنگارنگی مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انقلاب اسلامی کی سیاسی اور سماجی بنیادوں پر کاربند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انقلابیوں نے ترقی کی اور اپنی مشکلات سے پر زندگی کو فراموش کر کے ادب کے مختلف میدانوں میں تحقیق شروع کی شاید ان میں سے ایک اہم ترین بات اپنے ملک کے تمدن کی طرف رغبت اور غیر ملکی تمدن سے دوری انقلابی ادب وفن کی خصوصیت ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے انقلابات اور تغیرات فنی اور ادبی لحاظ سے ایک دوسرے کے قدم بہ قدم اور ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہر انقلاب کے لئے فن کی نمائش پروپگنڈہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

اگر مبالغہ سے کام نہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات ایسے بڑے حادثات واتفاقات بغیر فن اور ادب کی مدد کے وجود میں نہیں آسکتے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے اتفاقات کا وجود میں آنا بہت مشکل ہے۔

ایران کی تاریخ کا بڑا حصہ اس بات کا گواہ ہے کہ شعر و موسیقی انسانوں کے دلوں میں ہیجان انگیز انقلاب اور تغیر پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ رہے ہیں اور اس کا دوسری اقوام پر بھی ایسا ہی

اثر ہوتا ہے۔ اس لئے باوجود ابتدائی شکل میں ہونے اور نامکمل ہونے کے ادبیات اسلامی انقلاب کی نشر واشاعت کا سب سے بڑا اور جاذب ترین وسیلہ ہے۔

ایک طرز فکر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ ہر تمدن و تہذیب کی بقا اور سلامتی و نفوذ واشاعت فن کے قالب میں ہوتی ہے۔ خصوصاً ادبیات وہ بھی شعر حقیقت میں کسی سماج کے افراد پر اثر انداز ہونے اور لپنے پیام کو پہنچانے کا بڑا ذریعہ ہے۔

مذکورہ بالا مختصر تمہید کے ساتھ ہی میں ایک طرف تو ادبیات انقلاب کی اشاعت پر روشنی ڈالونگا تو دوسری طرف لپنے مقالہ کے حجم کو کم رکھتے ہوئے لپنے مطلب کو پورا کرنے اور مقالہ کو وقت پر ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں لپنے مقالہ میں ادبیات انقلاب ایران کی عمدہ خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری چند باتوں کا جو اس سے متعلق ہیں جیسے تحفظ اور دور جنگ کے ادب کا ذکر محدود کرونگا۔ اور تمام پہلوؤں پر روشنی ڈلتے ہوئے ان کے چند نمونے پیش کروں گا۔ میرے لئے اصل حوالوں کی (حیدرآباد میں) کمی اور اصل مواد سے ناآشنائی اس وقت ایک مسئلہ ہے۔ فی الحال ان سب باتوں سے گریز کرتے ہوئے لپنے مطلب کی طرف آرہا ہوں۔

جہاں کہیں بھی انقلاب اور تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یہ مکمل خود آگہی۔ تمدن کی تبدیلی اور فکر کی توانائی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یقیناً انقلاب اسلامی ایران کی وجہ سے تجدید حیات کے علاوہ انسانوں اور اسلام کی اہمیت، خودی کی پہچان اور بیرونی چیزوں کا بائیکاٹ ہوا۔ اور یہی مسائل ادبیات انقلاب کی نظم و نثر کی پیدائش کا موجب بنے اور خلاصہ فکر و احساس کے رد عمل کے طور پر تمام سماج کے ذہنوں پر چھا گئے۔

بیشک اعلیٰ فکر اور گہرے و پاک احساسات نظم و نثر کے قالب میں فن وادب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں انقلاب اسلامی کے بعد عوام کی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے ادبیات فارسی میں کمی و بیشی کے لحاظ سے خصوصاً ایسی نظم پیدا ہوئی جن میں سیاسی اور سماجی طور پر انقلاب کے دوران اور اس کے بعد جنگ تحمیلی کے موقعہ پر آٹھ سال کی مدت تک

شاعروں اور ہنرمندوں نے بہت سی تخلیقات کیں۔ان کے بعض مضامین میں اس صدی کے عوام کا درد و خواہشات، غصہ و غم، نکتہ چینی و فریاد اخون واگ، درد مند اور درد آشنا عوام کے جذبات، ستم دیدہ اور ظلم رسیدہ لوگوں کی فریاد کا حال ملتا ہے۔

انقلاب اسلامی کے ادبیات میں عام طور پر ہر نوع سخن میں سخن پردازی کی گئی ہے۔ اور انقلاب اور اس کے مسائل میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس کے معنی عوام کے جذبات کے آئنہ دار ہیں جس کو شاعروں اور ادیبوں نے جو ان ہی ستم رسیدہ اور غم نصیب عوام میں سے اٹھے ہیں عوام کے جذبات، احساسات و خواہشات کی اپنی نظم و نثر میں تصویر کشی کی ہے اور ان کے اعتراضوں اور فریاد کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جیسا کہ ادب ہمیشہ انسانوں خاص طور پر فنکاروں کو اس بات کی طرف راغب کرتا ہے کہ اپنے عوام کے مسائل پر نگاہ کریں اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ یہ سب ہنگامہ، حرکت اور قربانی و شہادت صرف انقلاب کے لئے ہیں۔اس سے پہلے عوام نے جنگ آزمائی نہیں کی۔فنی طور پر شاعر و ادیب اس بات کے معتقد ہیں کہ بہ لحاظ قواعد وہ ابھی کمزور ہیں۔

خصوصیات ادبیات انقلاب اسلامی

۱۔ اس دور کی ادبیات کی ایک بڑی اہم خصوصیت سماجی حالات کا بیان اور عام آدمی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔اس بنیاد پر شاعر اور ادیب کا فرض بنتا ہے کہ وہ عوام کے درد، مصیبت اور ان کی محرومیوں کو بیان کرے۔

۲۔ دوسری خصوصیت غلامی اور حکمرانی سے انسانوں کو چھٹکارا دلانے کے مختلف طریقے تلاش کرنا ہے۔کیونکہ انقلاب اسلام سے قبل ایرانی عوام مغربی تمدن اور استعمال سے متاثر تھے اور زیادہ تر مادی انحطاط کی طرف متوجہ تھے۔

۳۔ حاکموں اور عہدہ داروں اور اجارہ داوں سے عوام کو چھٹکارا دلانا بھی اس دور کا اہم موضوع ہے۔کیونکہ یہ ادب عوام کا ہے اور عوام کے لئے ہے اور ان کے مسائل کو بیان کرتا

ہے۔ تفنن اور روشن فکروں کا ادب اس بات سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح اس میں نفسانی خواہشات اور اسی طرح کے خیالات بھی نہیں ہیں اور شاعر و مصنف خود اپنے اظہار خیال اور سب کی خواہش کے لئے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ بلکہ یہ نشان دہی کرنی ہے کہ شاعروں اور لکھنے والوں کا غصہ ان ہی کے ایک گروہ سے اٹھا اور دھکتے ہوئے تنور کی گرمی میں صیقل ہوا اور وہ جو ایک نیا خیال رکھتے ہیں ان کا مقصد انسانی اقدار کی اہمیت و اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ ہے۔

۴۔ انقلابی شعر و ادب کی ایک بہت عمدہ خصوصیت خدا خواہی اور خدا شناسی ہے۔ ادبیات انقلاب اسلامی اس بات کی طرف متوجہ ہے کہ کس طرح انسان سوئے کبریا رجوع ہو۔ ہمارے ملک میں اس طرح کا ادیب ہر چیز کا محور خدا کو سمجھتا ہے اور سچائی کو اس کا ایک محرک اصلی جانتا ہے۔

۵۔ ادبیات انقلاب کی اور ایک جھلک انسان کو اہمیت دینا ہے کیونکہ قرآن کی آیتوں کے مصداق انسان خدا کا نائب یا خلیفہ ہے۔ اسی لئے انسانی روح کو بہت اہمیت دینی چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ادبیات انقلاب نے عوام کے مسائل کو سلجھانے کی طرف بہت توجہ کی ہے لیکن صرف اپنی ذات کی پہچان ہی کافی نہیں ہے بلکہ عوام کی موجودہ حالت میں تغیر و تبدیلی لائی جانا چاہیے

۶۔ ادبیات انقلاب کی ایک اور خصوصیت اپنی ہی طرف بازگشت ہے اور اہمیت اسلام ہے۔ اسی لئے عوام کی لڑائی میں شرکت انقلاب کا ثمر ہے، عوام کی روح کو بیدار کرنا اور اسلام کی طرف راغب کرنا ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ بہت سی توقعات اور امیدیں وابستہ ہیں۔

ان انقلابی ادیبوں اور شاعروں کی تبدیلی کی بنیادی تلاش اہمیت انقلاب کو خود اپنے آپ میں ظاہر کرنا ہے اور اس کا سب سے اچھا محور و مظہر اپنے خود کی طرف رجوع ہونا اور سیر الی اللہ اور روح انسانی کی ترقی ہے۔

۷۔ آیات قرآنی سے فائدہ اٹھا کر مختلف طریقوں سے عوام کے ذہنوں میں اہمیت ادبیات

انقلاب اسلامی کو اجاگر کرنا ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر یہ قرآن و حدیث اور تصوف اسلامی سے مملو ہے اور قرآنی مضامین سے بھرپور ہے ۔ ادب انقلاب میں اسلامی اثر کے نتیجہ کے طور پر اس دور کے شاعر کا ذہن جہاں بینی یعنی سارا جہاں ہمارا، کا تصور رکھتا ہے ۔ اس جگہ شاعر اجارہ داری کی بات خدا سے کہتا ہے اور وہ عوام کو چھٹکارہ دلانا چاہتا ہے اور ان سے ہمدردی اور ٹھنڈے دل سے ان کے معاملات پر غور کرتا ہے اس دور کی شاعری میں ہم اس قسم کے خیالات دیکھتے ہیں ۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبیات انقلاب وہ چیز ہے جو امید اور حرکت کو ایجاد کرتی ہے اور یاس اور ناامیدی کو دل سے زائل کرتی ہے ۔

۸۔ ظلم کے خلاف لڑائی اور جبر و ستم سے ستیز ادبیات انقلاب کی ایک خصوصیت ہے ۔ اس دور کے شاعر کا قلم تمام عوام کی طرف متوجہ ہے جو کہ لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ۔ پیسہ و طاقت کی بناء پر لوگوں کا استحصال کرنے والے دنیاوی طاقت، دولت اور جھوٹی شہرت کی بناء پر جو دانشمند اپنی فکر کی توانائیوں کو تباہ کر چکے تھے وہ اب ایسے عوام کے طرفدار ہو گئے جو کمزور اور مظلوم تھے ۔ البتہ یہ اونچے نظریات ہمیں عہد گزشتہ کے تاریک اشعار میں نظر آتے ہیں جو بہت ہی شدت اور وسیع طور پر دورہ مشروطیت اور دوسرے ادوار میں دیکھے جا سکتے ہیں اور جو آہستہ آہستہ بے رنگ ہوتے گئے ۔

۹۔ انقلابی ادب کی ایک اور خصوصیت طنز ہے ۔ انقلابی دور کے شاعر اور فنکار اپنے شعر و ادب میں طنز سے بھی کام لیتے ہیں ۔ اور عوام کی مشکلات و نزاعی معاملات سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ اسی لئے انقلابی عہد کا طنز نویس اور فنکار عوام کے مسائل کے بیان تک اپنے کو محدود نہیں کرتا بلکہ طنز اور تنقید کا نشانہ تمام دنیاداروں ۔ ظالموں، انسانوں کی بدنصیبی، درد اور مجبوری کے بیان کو بناتا ہے ۔ ہمارے عہد کے طنز نویس کی غصہ سے بھرپور نظر کا تیر تمام طنز نویسوں کی طرح انسانوں کی زخم خوردگی، درد، محرومی اور ستم کشی کی تاریخ کی طرف جاتا ہے

۱۰۔ زبان اور طرز بیان کے تغیر کو ادبیات انقلاب کا سب سے اہم صوری تغیر سمجھا جاتا

چاہیے۔ پھر بھی اہمیت قرآنی اور انقلاب، اور خود کی طرف بازگشت اور خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا حقیقت میں جدید ادب کا تازہ معیار ہے۔یہاں شعر کے پرانے قالب میں نئے مضامین سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ کچھ ایسے قدیم اقدار جو بھلائے جاچکے تھے پھر سے ایک نئے طریقہ سے استعمال ہونے لگے۔آج کے شاعروں کی توجہ قافیہ پر پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔ شعر انقلاب کے موضوع شعر گذشتہ سے بہت فرق رکھتے ہیں اور ان کی سب سے عمدہ خصوصیت دینی رنگ اور تشبیہات واستعارات اور دوسری صنعتیں ہیں۔ اسی طرح تلمیحات تضمین، آیات اور احادیث کا اقتباس اور اسلامی داستانوں کی طرف اشارے جو ایک زمانہ تک اشعار میں محدود اور اکثر معدوم ہوگئے تھے وہ انقلاب کے بعد کے ادب کی ایک خاص خصوصیت میں سے ایک ہے۔ اسی طرح ابہام اور پیچیدگیوں کا کم ہونا (بجز چند سبک ہندی کی طرف راغب شاعروں) کے خصوصیت شعر شاعرانہ انقلاب سمجھی جاتی ہے۔ شعر انقلاب کے ادب کی خصوصیات پر اگر ہم نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اس میں سے الفاظ اور ترکیبات قابل توجہ ہیں جو کہ سبک کے اعتبار سے اپنے پہلے کے ادب سے یعنی انقلاب سے قبل کے ادب سے مختلف ہے الفاظ مثل مستضعفان، مستکبران، شہید، شہادت، بسیجی، جبہہ، فجر، اللہ اکبر، عاشورا، قدس وغیرہ کے انقلاب کے اشعار میں زیادہ نظر آتے ہیں۔یا ایسی نئی ترکیبیں جو نثر میں شامل ہوگئی ہیں بہت زیادہ ہیں۔یہاں صرف آیت اللہ امام خمینیؒ کے کلام کو سند کے طور پر پیش کیا جائے گا ترکیبیں جیسے: کبوتران حرم اسلام، درخت جہنمی، استعمار، کمینگاہ، محرابی ساجد، نعت خواران استعمار اثر، خرقہ، خاکی، فضائی آماد، جوار معشوق، ستارہ نحس، مستکبران، کوثر عاشورا، زمزم ھدایت، مرفہین بی درد، زیتون نور واگیار مدگ وغیرہ۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جہاں ادبیات انقلاب میں مثبت ترقی ہوئی ہے وہیں کمزوری اور سستی خصوصاًصوری اور زبانی لحاظ سے موجود ہے۔جو شاید زیادہ تر نا تجربہ کاری اور مطالعہ کی کمی اور جلد بازی کی وجہ سے ہے اور یہ سب ایک فطری چیز ہے۔ کیونکہ ابھی انقلاب کی عمر زیادہ نہیں ہوئی ہے۔البتہ ان آخری چند سالوں میں نثر میں پختگی اور طرز

بیان میں خوبی پیدا ہوئی۔

یہاں پر ان کمزوریوں کا دو حصوں میں نظم و نثر کا علحدہ علحدہ ذکر کرونگا۔

الف۔ شعر

۱۔ بعد از انقلاب کے شاعروں کی جلد بازی

۲۔ بعض اشعار میں مضامین کی تکرار

۳۔ تصوف و عرفان کی اصطلاحوں اور مطالب کو بیان کرنے کا رجحان اور اس کا اعادہ

۴۔ بعض شاعروں کا شعر کے فنی قواعد و قوانین سے ناواقفیت

۵۔ درجہ دوم و سوم کے شاعروں کی تقلید نہ کرنا جو مشہور ہیں۔

۶۔ بعض شاعروں کی نظموں میں تازہ اور نیا بیان نہیں پایا جاتا

۷۔ بعض نظموں میں غیر معمولی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال

ب۔ نثر

۱۔ داستان کو طوالت سے بیان کرنا۔

۲۔ بعض مضامین میں قواعد و آئین زبان کی رعایت نہ رکھنا

۳۔ لکھنے والے کا لغت اور تعبیروں سے کم واقفیت ہونا

۴۔ مناسب الفاظ کا استعمال مترادفات الفاظ میں نہیں کرنا

۵۔ ان الفاظ اور کلموں کے مترادف الفاظ و کلموں کا استعمال کرنا جن کی کچھ ضرورت ہی نہیں۔

۶۔ دنیا کے تغیرات و تبدیلیوں سے بے خبری اور بے توجہی

۷۔ محاورہ، عوام کی زبان اور متروک الفاظ کا زیادہ استعمال جس سے نثر میں کمزوری اور بدصورتی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ سب کمزوریاں تمام تصانیف میں نہیں پائی جاتیں اور دور انقلاب کے لکھنے والوں میں بھی پختہ کار نثر نگار اور بہت ہی اچھے لکھنے والے

موجود ہیں۔

اسی طرح ضروری ہے کہ ادبیات زمانہ تحفظ اور ادبیات جنگ کی طرف ذرا سا اشارہ کرتا چلوں۔ان میں سے زیادہ تر الفاظ اور مطالب جو نظم ونثر میں ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ تر ان موضوعات پر ہیں جیسے مدافعت حق پرست بر باطل پرستاں اور ایسے لوگوں کا تحفظ جو ہماری سر زمین اسلامی پر دشمنوں کے مقابل اپنے سر ہتھیلی پر لئے کھڑے تھے۔

ادبیات مقاومت وتحفظ کا موضوع اگر چہ کہ قدیم آثار سے تعلق رکھتا ہے اور گذشتہ صدی کی نظم ونثر کا نمونہ ہیں اور ان کا نشان اور وضع شاہنامہ فردوسی کی ہے۔جیسے داستان کاوہ آھنگرو وضحاک، یا فرقہ شعوبیہ و سربداروں کی بنی امیہ وتیمور سے جنگ اور وہ منظوم جنگ نامے جو پرتگالیوں کے حملہ کے وقت جزائر جنوب میں جنوب کے عوام کا دلیرانہ دفاع اور اسی طرح کی چیزوں کا ہم اس میں مشاہدہ کرتے ہیں۔لیکن ادب کا عروج اور وسعت وپائداری کو دیکھا جائے تو اس کا آغاز فتح علی شاہ کے دور سے ہوا اور روس وایران کی جنگ کے زمانہ سے دور مشروطیت کا آغاز ہوا مشروطیت کے بعد انقلاب اسلامی اور اس کے بعد آٹھ سال دفاع مقدس ولڑائیوں میں جان دینے والے، اشیار کرنے والے اور جنگ تحمیلی میں حصہ لینے والے تھے۔اگر چہ کہ ادبیات مقاومت جنگ ونبرد اور ادبیات جنگ سے بہت مشابہت اور ارتباط رکھتے ہیں۔اسی طرح ان میں بنیادی فرق یہ دو دیکھے جاسکتے ہیں۔مقاومت کے ادب میں حاکموں اور ان کے تسلط کے خلاف داخلی اور خارجی چیزوں کا بیان ایک اہم شرط ہے جو ادب کی شکل میں ظاہر ہوا۔اور ان ملکوں کی تہذیب کو بتلاتا ہے جو تسلط اور حکمرانی رکھتے تھے۔دوسری چیز ادب کا عوام سے نزدیک ہونا اور عوامی زبان کا استعمال ہے۔اگر چہ کہ بہت سے عام لوگ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔جنہوں نے اس بات میں پہل کی اور اس کو ایجاد کیا۔

اس طرح گذشتہ ادبیات کی تاریخ میں عوام کی خاطر نہیں لکھا گیا جو ادب مقاومت میں ہم کم دیکھتے ہیں۔صرف روایات سے بغاوت اور آدمیوں میں حرکت اور بیداری کا پیدا ہونا ہے جو ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے ظاہر ہو۔جنگ کے وقت ہم اس ادبیات مقاومت

ادبیات جنگ کے تمدن کا ایک حصہ سمجھیں گے ۔اس طرح لڑنے والے ، داستانیں ، تحقیق ، رپورٹیں ، وصیت نامہ وغیرہ ادبیات مقاومت کا ایک عظیم سرمایہ سمجھے جاتے ہیں ۔

ادبیات جنگ بیان رزمیہ ، ہنگامہ ، شور و غوغا ، شعر و سرود یہ سب جان و مال کی قربانی کے ترجمان ، سچائی اور سنجیدگی ، محبوب حقیقی سے وصل کا شوق ۔ رہبر سے عشق ۔اور انسان کی معراج ملکوتی قید و بند سے رہائی جنہوں نے اپنے تمام عزیزوں سے الگ رہ کر ملک کی مدافعت کے لئے نبرد آزمائی کی اور خلوص کے ساتھ جنگ کی ۔زیادہ تر شہید ہوئے ۔ کچھ لوگ جنت کو سدھارے ۔آج ہمیں ان کی یاد شان و عظمت کے ساتھ آتی ہے جو جنگ تحمیلی میں لڑکر ہمیشہ کیلئے زندہ اور سرفراز ہونگے ۔

اس جنگ تحمیلی اور اس کے مختلف مراحل کے نشیب و فراز کی تصویر ، بہادروں کا بیان اور دلاوروں کی بہادری اور جنگ کے مختلف مراحل کا بیان ۔شاعروں اور لکھنے والوں کے فن میں مختلف صورتوں سے جلوہ گر ہوئی اور دوسرے ادبیات جنگ کے انقلابی فنکار ایسے ہیں جن کے آگے کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ زبان کھولے ۔یہاں چند شاعران انقلاب کا نمونہ کلام پیش کرتے ہوئے اپنے کلام کو ختم کرونگا ۔

در چار راہ شہادت از طاہرہ صفار زادہ

آئینیہ زمان است ، این پیر در جماران از نصر اللہ مردانی

بخشی از سرودہ "شعری برای جنگ " از قیصر امین پور

ارمغان ایران و ھند

(فارسی کا شعری سفر)

مصنف

ڈاکٹر زیب حیدر

ریڈر شعبہ فارسی

ویمنس کالج۔ عثمانیہ یونیورسٹی